بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

بہترین انتقام: اتحاد بین المسلمین!

اگرچہ خودکش حملوں سے انسانی خون کے چھوٹتے فوارے اور ڈرون حملوں سے بستیوں کے قبرستانوں میں تبدیل ہونے جیسے اندوہناک واقعات اب ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں‘ لیکن گزشتہ دنوں جامعہ نعیمیہ لاہور کے مہتمم علامہ ڈاکٹر مفتی محمد سرفراز نعیمی کو ایک خودکش حملے میں شہید کر دینے کے واقعہ نے مسلمانانِ پاکستان کو بری طرح رُلایا۔ کیا اور کس کا بگاڑا تھا اس درویش منش‘ حلیم الطبع انسان نے جو کم گو تھا‘ ملنسار تھا اور دوسرے کی بات اور مخالفانہ رائے کو بڑے حوصلے اور برداشت سے سنتا تھا! سادگی کے حوالے سے وہ کسی طرح بھی اکیسویں صدی کی معروف شخصیت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک بہت بڑے دارالعلوم اور جامعہ کا مہتمم ہونے کے باوجود اپنی پرانی موٹر سائیکل پر لاہور کے گلی کوچوں میں گھومنا‘ جلسوں‘ سیمیناروں میں شرکت اور اعلیٰ سرکاری اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں کرنا ان کا معمول تھا‘ اور وہ کبھی بھی اس میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ پروٹوکول کا لفظ ان کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔ خود ہی اپنے سیکرٹری تھے۔ کسی پروگرام کے حوالے سے ان سے بات کی جاتی تو تھیلے سے ایک پھٹی پرانی سی بیاض برآمد کرتے‘ اگر اُس تاریخ اور وقت پر کوئی اور مصروفیت نہ ہوتی تو اس پر درج کر کے آپ سے وعدہ کر لیتے‘ وگرنہ معذرت کر لیتے۔

کس نے یہ ناحق قتل کیا اور کیوں کیا؟ ہم سمجھتے ہیں اس کے لیے ارسطو کی دانش مطلوب نہیں۔ دشمنانِ اسلام چاروں اطراف سے پاکستان پر حملہ آور ہیں۔ وہ عسکری سطح پر بھی ہم پر گولہ بارود کی بارش کر رہے ہیں‘ بلکہ خود ہمارے ہاتھوں سے کروا رہے ہیں۔ سیاسی سطح پر وہ اُن لوگوں کو مسندِ اقتدار پر براجمان کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو پاکستان اور اسلام کے ازلی اور ابدی دشمن کے بارے میں تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں‘ اور اپنے مسلمان بھائیوں کو حقیقی خطرہ قرار دے رہے ہیں۔ میڈیا خصوصاً الیکٹرونک میڈیا کی بدولت اخلاقی اور سماجی سطح پر ہمارے معاشرے میں پہلے ہی انقلاب آ چکا ہے‘ اور اخلاقی اقدار اور مذہبی روایات

کو دقیانوسی سوچ کا نتیجہ اور مظہر قرار دیا جانے لگا ہے۔

رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کو مکمل شکست فاش سے دوچار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دے کر فرقہ واریت کی آگ بھڑکائی جائے۔ جن افغان طالبان نے امریکہ کی ناک میں دم کیا ہوا ہے وہ دیوبندی حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا دشمن نے دیوبندی بریلوی فسادات کی سکیم بنائی۔ الحمدللہ ڈاکٹر سرفراز نعیمی اور دوسرے مسالک کے اکابرین نے اس سازش کی بو کو سونگھ لیا، لہٰذا ڈاکٹر سرفراز نعیمی کی سربراہی میں جو ملی مجلس شرعی کا ایک پلیٹ فارم پہلے سے ہی موجود تھا، جس میں تمام مسالک کی نمائندگی موجود تھی لیکن اس کا دائرۂ کار صرف فکری ونظری سطح پر کام کرنا تھا، اس کے دائرۂ کار کو وسیع کیا گیا۔ امریکی مداخلت کو ختم کیا جائے اور شریعت محمدیؐ پورے ملک میں بلاامتیاز نافذ کی جائے، یہ دو نکاتی ایجنڈا طے ہوا۔ ملک بھر میں ایسی کانفرنسیں منعقد کی گئیں جن میں اہلحدیث، دیوبندی، بریلوی اور اہل تشیع نے مشترکہ طور پر شرکت کی۔ اگرچہ بعض نام نہاد علماء پڑھی پڑھائی اور سیکھی سکھائی بولی بول رہے تھے لیکن انہیں عوام میں پذیرائی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ ہماری پختہ اور سوچی سمجھی رائے ہے کہ انہیں قوت فراہم کرنے کے لیے اور جذبات کو بھڑکا کر عقل پر حاوی کرنے کے لیے یہ خون ناحق کیا گیا۔ لیکن الحمدللہ، ثم الحمدللہ، ڈاکٹر سرفراز نعیمی کی طرح ان کے صاحبزادے راغب نعیمی بھی دشمن کی اِس سازش کو بھانپ گئے اور انہوں نے بہت جلد کارکنوں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا کہ وہ جلاؤ گھیراؤ یا اپنوں پر دشنام طرازی نہیں کریں گے۔ لہٰذا ایک بار پھر دشمن کی سازش ناکام ہو گئی ہے، لیکن ہم مسلمانانِ پاکستان سے درخواست کریں گے کہ مشتری ہوشیار باش! دشمن حملہ کرنے سے نہیں چوکے گا، اگلا حملہ کسی دیوبندی یا اہلحدیث مدرسہ پر ہو سکتا ہے۔ ہماری رائے میں دشمن سے بہترین انتقام ہمارا اتحاد ہے۔ اگر دشمن ہمارے اتحاد میں دراڑیں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو ہم شکست سے دوچار ہو جائیں گے۔ ہماری فتح کا راز نظری، عملی اور حقیقی اتحاد میں مضمر ہے —— اور اتحاد بین المسلمین بہترین انتقام ہے!!

دورۂ ترجمۂ قرآن **ڈاکٹر اسرار احمد**

سُورۂ اٰلِ عِمران

آیات ۱۸۱ تا ۱۸۹

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا
قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (۱۸۱) ذٰلِكَ
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۱۸۲) اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَ
كُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ (۱۸۳) فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (۱۸۴) كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ
اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۱۸۵) لَتُبْلَوُنَّ فِىْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟
وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى
كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۸۶) وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ
مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ
ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ (۱۸۷) لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا ۖ فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۸۸) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۱۸۹)

آیت ۱۸۱ ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ م﴾ ’’اللہ نے سن لیا ہے قول ان لوگوں کا جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔‘‘

یہ بات کہنے والوں میں منافقین بھی شامل ہو سکتے ہیں اور یہودی بھی۔ جب رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو انفاقِ مال کی ترغیب دیتے تھے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو یہودیوں اور ان کے زیر اثر منافقوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہاں اللہ فقیر ہو گیا ہے اور ہم سے قرض مانگ رہا ہے‘ جبکہ ہم غنی ہیں‘ ہمارے پاس دولت ہے۔

﴿سَنَکْتُبُ مَا قَالُوْا﴾ ’’ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انہوں نے کہا ہے‘‘

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی جھلکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فوراً تو گرفت نہیں کرتا لیکن ایک وقت آئے گا جس دن انہیں اپنے اس قول کی پوری سزا مل جائے گی۔ اور صرف یہی نہیں:

﴿وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ لا﴾ ’’اور ان کے ناحق قتل انبیاء کو بھی (لکھ رکھیں گے)‘‘

اس سے پہلے یہ جو نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں ان کا یہ جرم بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔

﴿وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۱۸۱﴾ ’’اور ہم کہیں گے اب چکھو مزا اس جلا دینے والی آگ کے عذاب کا۔‘‘

آیت ۱۸۲ ﴿ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ﴾ ’’یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے‘‘

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۱۸۲﴾ ’’اور اللہ تو اپنے بندوں کے حق میں ہرگز ظالم نہیں ہے۔‘‘

آیت ۱۸۳ ﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَآ﴾ ’’جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے ایک عہد لے لیا تھا‘‘

﴿اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُهُ النَّارُ ط﴾ ’’کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھا جائے۔‘‘

یہاں روئے سخن پھر یہود کی طرف ہو گیا ہے۔ نوعِ انسانی جب عہدِ طفولیت میں تھی تو خرقِ عادت چیزیں بہت ہوا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شخص اللہ کی

جناب میں کوئی جانور ذبح کر کے پیش کرتا تو آسمان سے ایک آگ اُترتی جو اسے بھسم کر دیتی تھی اور یہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ یہ قربانی قبول ہوگئی۔ جیسے ہابیل اور قابیل کے قصے میں آیا ہے کہ: ﴿اِذۡ قَرَّبَا قُرۡبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنۡ اَحَدِهِمَا وَلَمۡ يُتَقَبَّلۡ مِنَ الۡاٰخَرِ﴾ (المائدۃ:۲۷) ’’جب دونوں نے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی‘‘۔ یہ پتا کیسے چلا؟ عید الاضحیٰ کے موقع پر ہم جو قربانیاں کرتے ہیں ان کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ کس کی قربانی قبول ہوئی اور کس کی قبول نہیں ہوئی۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن پہلے ایسی حسّی علامات ہوتی تھیں کہ پتا چل جاتا تھا کہ یہ قربانی اللہ نے قبول کر لی ہے۔ بنی اسرائیل کے ابتدائی دور میں بھی یہ نشانی موجود تھی کہ آسمان سے اُترنے والی آگ کا قربانی کو بھسم کر دینا اس کی قبولیت کی علامت تھی۔ مدینہ کے یہود نے کٹ حجتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے تو اللہ نے یہ عہد لے لیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ وہ یہ معجزہ نہ دکھائے۔ تو اگر محمد (ﷺ) واقعی رسولؐ ہیں تو یہ معجزہ دکھائیں۔ اس کا جواب دیا جا رہا ہے:

﴿قُلۡ قَدۡ جَآءَكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِىۡ بِالۡبَيِّنٰتِ﴾ ’’(اے نبیﷺ! ان سے) کہیے تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں واضح معجزوں کے ساتھ‘‘

﴿وَبِالَّذِىۡ قُلۡتُمۡ﴾ ’’اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو‘‘

انہوں نے سوختنی قربانی کا معجزہ بھی دکھایا جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔

﴿فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۝۱۸۳﴾ ’’پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو؟‘‘

آیت ۱۸۴ ﴿فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ﴾ ’’پھر (اے نبیؐ) اگر وہ آپؐ کو جھٹلا دیں‘‘

تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ معاملہ صرف آپؐ ہی کے ساتھ نہیں ہوا۔

﴿فَقَدۡ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ﴾ ’’تو آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے‘‘

یہ تو اس راستے کا ایک عام تجربہ ہے‘ جس سے آپؐ کو بھی گزرنا پڑے گا۔

﴿جَآءُوۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالۡكِتٰبِ الۡمُنِيۡرِ۝۱۸۴﴾ ’’جو آئے تھے واضح نشانیاں

اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر۔‘‘

آیت ۱۸۵ ﴿کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ﴾ ’’ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے‘‘۔ موت تو ایک دن آ کر رہنی ہے۔

﴿وَ اِنَّمَا تُوَفَّوۡنَ اُجُوۡرَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ﴾ ’’اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ تو قیامت ہی کے دن دیا جائے گا۔‘‘

﴿فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّۃَ فَقَدۡ فَازَ ؕ﴾ ’’تو جو کوئی بچا لیا گیا جہنم سے اور داخل کر دیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا۔‘‘

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجۡعَلۡنَا مِنۡھُمۡ اے اللہ! ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمانا!

﴿وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ (۱۸۵)﴾ ’’اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے۔‘‘

آیت ۱۸۶ ﴿لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ۟ ﴾ ’’(مسلمانو! یاد رکھو) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی۔‘‘

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع میں گزر چکا ہے: ﴿وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (آیت ۱۵۵) ’’اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مالوں‘ جانوں اور ثمرات کے نقصان سے‘‘۔ یہاں مجہول کا صیغہ ہے کہ تمہیں لازماً آزمایا جائے گا‘ تمہاری آزمائش کی جائے گی تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی۔ کان کھول کر سن لو کہ یہ ایمان کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں ہے‘ یہ کانٹوں بھرا بستر ہے۔ ایسا نہیں ہو گا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے اور بغیر تکلیفیں اٹھائے تمہیں جنت مل جائے گی۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۴) میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ’’کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات و واقعات وارد نہیں ہوئے جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے......‘‘

﴿وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا ؕ﴾ ’’اور تمہیں لازماً سننی پڑیں گی ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا بڑی تکلیف دہ باتیں۔‘‘

یہ سب کچھ سنو اور صبر کرو۔ جیسے رسول اللہ ﷺ سے ابتدا میں کہا گیا تھا: ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ۝۱۰﴾ (المزمل) ”اور ان باتوں پر صبر کیجیے جو یہ لوگ کہتے ہیں اور وضعداری کے ساتھ ان سے الگ ہو جائیے“۔ آپ ﷺ کو کیا کچھ نہیں سننا پڑا۔ کسی نے کہہ دیا مجنون ہے، کسی نے کہہ دیا شاعر ہے، کسی نے کہا ساحر ہے، کسی نے کہا مسحور ہے۔ سورۃ الحجر کے آخر میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ۝۹۷﴾ ”(اے نبی ﷺ) ہمیں خوب معلوم ہے کہ یہ (مشرکین) جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچتا ہے“۔ ان کی زبانوں سے جو کچھ آپؐ کو سننا پڑ رہا ہے اس سے آپؐ کو تکلیف پہنچتی ہے، لیکن صبر کیجیے! وہی بات مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے۔

﴿وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝۱۸۶﴾ ”اور اگر تم صبر کرتے رہو گے (ثابت قدم رہو گے) اور تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھو گے تو بے شک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔“

آیت ۱۸۷ ﴿وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِیۡثَاقَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ﴾ ”اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے ایک قول وقرار لیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی“

﴿لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکۡتُمُوۡنَهٗ﴾ ”کہ تم لازماً اُسے لوگوں کے سامنے واضح کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں“

﴿فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ﴾ ”تو انہوں نے اس عہد کو پس پشت پھینک دیا“

﴿وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ﴾ ”اور اس کی بڑی حقیر سی قیمت وصول کر لی۔“

﴿فَبِئۡسَ مَا یَشۡتَرُوۡنَ ۝۱۸۷﴾ ”تو بہت ہی بری شے ہے جو وہ (اس کے بدلے میں) حاصل کر رہے ہیں۔“

آیت ۱۸۸ ﴿لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اَتَوۡا﴾ ”آپ ان کے بارے میں خیال نہ کریں جو اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں“

اگر کچھ نیکی کر لیتے ہیں، کسی کو کچھ دے دیتے ہیں تو اس پر بہت اتراتے ہیں، اکڑتے ہیں کہ ہم نے یہ کچھ کر لیا ہے۔

﴿وَّیُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا ص﴾ ”اور (اس سے بھی بڑھ کر) چاہتے

ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں پر جو انہوں نے کیے ہی نہیں‘‘

آج کل اس کی سب سے بڑی مثال سپاس نامے ہیں‘ جو تقریبات میں مدعو شخصیات کو پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سپاس ناموں میں ان حضرات کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں بیان کیے جاتے ہیں جو ان کی پشتوں میں سے بھی کسی نے نہ کیے ہوں۔ اس طرح ان کی خوشامد اور چاپلوسی کی جاتی ہے اور وہ اسے پسند کرتے ہیں۔

﴿فَلَا تَحۡسَبَنَّهُمۡ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ ۚ﴾ ’’تو ان کے بارے میں یہ خیال نہ کریں کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔‘‘

﴿وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ (۱۸۸)﴾ ’’اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔‘‘

آیت ۱۸۹ ﴿وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ’’اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (۱۸۹)﴾ ’’اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

آیات ۱۹۰۔۲۰۰

﴿اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ (۱۹۰) الَّذِيۡنَ يَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِهِمۡ وَيَتَفَكَّرُوۡنَ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱) رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَيۡتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (۱۹۲) رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ (۱۹۳) رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخۡزِنَا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ (۱۹۴) فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ اَنِّىۡ لَاۤ اُضِيۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى ۚ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ (۱۹۵) لَا

یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ (١٩٦) مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۟ قف ثُمَّ مَاۡوٰىھُمۡ جَھَنَّمُ ؕ
وَبِئۡسَ الۡمِھَادُ (١٩٧) لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّھُمۡ لَھُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا
الۡاَنۡھٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ (١٩٨) وَاِنَّ
مِنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ لَمَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡھِمۡ
خٰشِعِیۡنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ
رَبِّھِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ (١٩٩) یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا
وَرَابِطُوۡا ۟ قف وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (٢٠٠) ﴾

سورۂ آل عمران کا آخری رکوع قرآن مجید کے عظیم ترین مقامات میں سے ہے۔ اس کی پہلی چھ آیات کے بارے میں روایت آتی ہے کہ جس شب میں یہ نازل ہوئیں تو پوری رات حضورﷺ پر رقت طاری رہی اور آپﷺ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہوئے روتے رہے۔ نمازِ تہجد کے دوران بھی آپؐ پر رقت طاری رہی۔ پھر آپؐ نے بہت طویل سجدہ کیا، اس میں بھی گریہ طاری رہا اور سجدہ گاہ آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر آپؐ کچھ دیر لیٹے رہے لیکن وہ کیفیت برقرار رہی۔ یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی۔ حضرت بلالؓ جب فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوئے اور آپؐ کو اس کیفیت میں دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ آپﷺ نے فرمایا: ’’اے بلال، میں کیوں نہ روؤں کہ آج کی شب میرے ربّ نے مجھ پر یہ آیات نازل فرمائی ہیں‘‘۔ پھر آپؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی (اس روایت کو امام رازی نے تفسیر کبیر میں بیان کیا ہے) یعنی وہ گریہ اور رقت شکر کے جذبے کے تحت تھی۔

یہ بھی نوٹ کیجیے کہ یہ سورۂ آل عمران کا بیسواں رکوع شروع ہو رہا ہے اور سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت کے الفاظ یہ تھے: ﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِھَا وَبَثَّ فِیۡھَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (١٦٤) ﴾ اسی ’’آیت الآیات‘‘ کا خلاصہ یہاں آ گیا ہے:

آیت ۱۹۰ ﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّھَارِ ﴾ ’’یقیناً

آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں''

﴿لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۱۹۰﴾ ''ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی: ﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۱۶۴﴾ ''اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔ یہاں ان لوگوں کو ''اُولوا الالباب'' کا نام دیا گیا۔ یہ ہدایت کا پہلا قدم ہے کہ کائنات کو دیکھو، مظاہر فطرت کا مشاہدہ کرو۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یہ سب آیاتِ الٰہیہ ہیں، ان کو دیکھو اور اللہ کو پہچانو۔ اگلا قدم یہ ہے کہ جب اللہ کو پہچان لیا تو اب اُسے یاد رکھو۔ یعنی

فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

آیت ۱۹۱ ﴿الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾ ''جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی''

﴿وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج﴾ ''اور مزید غور و فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔''

اس غور و فکر سے وہ ایک دوسرے نتیجے پر پہنچتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ج﴾ ''اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔''

اور پھر ان کا ذہن اپنی طرف منتقل ہوتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میں کس لیے پیدا کیا گیا ہوں؟ کیا میری زندگی بس یہی ہے کہ کھاؤ پیو، اولاد پیدا کرو اور دنیا سے رخصت ہو جاؤ؟ معلوم ہوا کہ نہیں، کوئی خلا ہے۔ انسانی اعمال کے نتیجے نکلنے چاہئیں، انسان کو اس کی نیکی اور بدی کا بدلہ ملنا چاہیے، جو اس دنیا میں اکثر و بیشتر نہیں ملتا۔ دنیا میں اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ نیکوکار فاقوں سے رہتے ہیں اور بدکار عیش کرتے ہیں۔ چنانچہ کوئی اور زندگی ہونی چاہیے، کوئی اور دنیا ہونی چاہیے جس میں اچھے برے اعمال کا بھرپور بدلہ مل جائے، مکافاتِ عمل ہو۔ لہٰذا وہ

کہہ اٹھتے ہیں:

﴿سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾﴾ ''تو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)، پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا!''

تو نے یقیناً ایک دوسری دنیا تیار کر رکھی ہے، جس میں جزا و سزا کے لیے جنت بھی ہے اور جہنم بھی!

آیت ۱۹۲ ﴿رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ﴾ ''اے ہمارے ربّ! جس کو تو نے داخل کر دیا آگ میں بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا۔''

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾﴾ ''اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔''

آیت ۱۹۳ ﴿رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِیًا﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا''

﴿یُّنَادِیۡ لِلۡاِیۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ فَاٰمَنَّا ٭ۖ﴾ ''جو ایمان کی ندا دے رہا تھا کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر، تو ہم ایمان لے آئے۔''

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے بعد ایسے لوگوں کے کانوں میں جونہی کسی نبی یا رسول کی پکار آتی ہے تو فوراً لبیک کہتے ہیں، ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے فوری طور پر رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول کر لی، اس لیے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت تک تو وہ خود پہنچ چکے تھے۔ سورۃ الفاتحہ کے مضامین کو ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ اولوا الالباب میں سے ایک شخص جو اپنی سلامتیٔ طبع، سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل کی رہنمائی میں یہاں تک پہنچ گیا کہ اُس نے اللہ کو پہچان لیا، آخرت کو پہچان لیا، یہ بھی طے کر لیا کہ اُسے اللہ کی بندگی ہی کا راستہ اختیار کرنا ہے، لیکن اس کے بعد وہ نبوت و رسالت کی راہنمائی کا محتاج ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے حضور دست سوال دراز کرتا ہے: ﴿اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴾ یہاں بھی یہی مضمون ہے کہ اب ایسے شخص کے سامنے اگر کسی نبی کی دعوت آئے گی تو اُس کا ردِّعمل کیا ہو گا۔ اب آگے ایک عظیم ترین دُعا آ رہی ہے۔ یہ اُس دُعا سے جو سورۃ البقرہ کے آخر میں آئی تھی بعض پہلوؤں سے کہیں زیادہ عظیم تر ہے۔

﴿رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا﴾ ''اے ہمارے ربّ، ہمارے گناہ بخش دے!''

﴿وَ کَفِّرۡ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا﴾ ''اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے!''

ہمارے نامۂ اعمال کے دھبے بھی دھو دے اور ہمارے دامن کردار کے جو داغ ہیں وہ بھی صاف کر دے۔

﴿وَتَوَفَّـنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ (۱۹۳)﴾ ''اور ہمیں وفات دیجیو اپنے نیکوکار (اور وفادار) بندوں کے ساتھ۔''

آیت ۱۹۴ ﴿رَبَّـنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدۡتَّـنَا عَلٰی رُسُلِکَ﴾ ''اے ہمارے رب' ہمیں بخش وہ سب کچھ جس کا تو نے وعدہ کیا ہے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے سے''

﴿وَلَا تُخۡزِنَا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ﴾ ''اور ہمیں رسوا نہ کیجیو قیامت کے دن۔''

﴿اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ (۱۹۴)﴾ ''یقیناً تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا۔''

ہمیں شک ہے تو اس بات میں کہ آیا ہم تیرے ان وعدوں کے مصداق ثابت ہو سکیں گے یا نہیں۔ لہٰذا تو اپنی شانِ غفاری سے ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرنا اور ہمیں وہ سب کچھ عطا کر دینا جو تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے وعدہ کیا ہے۔

آیت ۱۹۵ ﴿فَاسۡتَجَابَ لَهُمۡ رَبُّهُمۡ﴾ ''تو ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی''

یہ ہے دعا کی قبولیت کی انتہا کہ اس دعا کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا اعلان ہو رہا ہے۔

﴿اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ﴾ ''کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔''

﴿بَعۡضُکُمۡ مِّنۡ بَعۡضٍ ۚ﴾ ''تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو۔''

ایک ہی باپ کے نطفے سے بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی' اور ایک ہی ماں کے رحم میں بیٹا بھی پلا ہے اور بیٹی بھی۔

﴿فَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِهِمۡ﴾ ''سو جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے''

﴿وَاُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ﴾ ''اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں''

﴿وَقٰـتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا﴾ ''اور جنہوں نے (میری راہ میں) جنگ کی اور جانیں بھی

دے دیں''

﴿لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡھُمۡ سَیِّاٰتِھِمۡ﴾ ''میں لازماً اُن سے اُن کی برائیوں کو دور کر دوں گا''
ان کے نامۂ اعمال میں اگر کوئی دھبے ہوں گے تو انہیں دھو دوں گا۔

﴿وَلَاُدۡخِلَنَّھُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ ۚ﴾ ''اور لازماً داخل کروں گا انہیں ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

﴿ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور یہ بدلہ ہوگا اللہ کے پاس سے۔''
یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص خزانۂ فضل سے۔

﴿وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ۝۱۹۵﴾ ''اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

اب آخری پانچ آیات جو آ رہی ہیں ان کی حیثیت اس سورۂ مبارکہ کے تمام مباحث پر ''خاتمۂ کلام'' کی ہے۔ یاد رہے کہ اس سورہ میں اہل کتاب کا عمومی ذکر بھی ہوا ہے اور یہود و نصاریٰ کا الگ الگ بھی۔ پھر اس میں اہل ایمان کا ذکر بھی ہے اور مشرکین کا بھی۔ اب فرمایا:

آیت ۱۹۶ ﴿لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ ۝۱۹۶﴾ ''(اے نبیؐ) آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے ان کافروں کی چلت پھرت شہروں کے اندر۔''

یہ کافر جو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں' اور اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے سازشیں کر رہے ہیں' جمعیتیں فراہم کر رہے ہیں' اس سے آپؐ کسی دھوکے میں نہ آئیں' کسی مغالطے کا شکار نہ ہوں' ان کی طاقت کے بارے میں کہیں آپؐ مرعوب نہ ہو جائیں۔

آیت ۱۹۷ ﴿مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۟﴾ ''یہ تو بس تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے''
یہ تو محض چند روزہ زندگی کے لیے ہم نے انہیں کچھ ساز و سامان دے دیا ہے۔

﴿ثُمَّ مَاۡوٰىھُمۡ جَھَنَّمُ ؕ﴾ ''پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے۔''

﴿وَبِئۡسَ الۡمِھَادُ ۝۱۹۷﴾ ''اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۱۹۸ ﴿لٰکِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّھُمۡ﴾ ''اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنے ربّ کا تقویٰ اختیار کیا''

﴿لَھُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا﴾ ''ان کے لیے

باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے‘‘

﴿نُزُلاً مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’یہ ان کے لیے ابتدائی مہمان نوازی ہو گی اللہ کی طرف سے‘‘۔

﴿وَمَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۸﴾﴾ ’’اور مزید جو اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے نیکوکاروں کے لیے‘‘۔

جنت کی اصل نعمتیں تو بیان میں آ ہی نہیں سکتیں۔ ان کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی یہ متفق علیہ حدیث یاد رکھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی : اَعۡدَدۡتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیۡنَ مَالَا عَیۡنٌ رَأَتۡ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتۡ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلۡبِ بَشَرٍ))(۱)

’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا، اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی گزرا۔‘‘

قرآن و حدیث میں جنت کی جن نعمتوں کا تذکرہ ہے ان کی حیثیت اہل جنت کے لیے نُزُل (ابتدائی مہمان نوازی) کی ہوگی۔

آیت ۱۹۹ ﴿وَاِنَّ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَمَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ﴾ ’’اور بے شک اہل کتاب میں وہ بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر‘‘

﴿وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ﴾ ’’اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو ان کی طرف نازل کیا گیا‘‘

﴿خٰشِعِیۡنَ لِلّٰہِ ۙ﴾ ’’اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں‘‘

ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے، وہ عاجزی اور تواضع اختیار کرتے ہیں۔

﴿لَا یَشۡتَرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ﴾ ’’وہ اللہ کی آیات کو حقیر سی قیمت پر فروخت نہیں کرتے۔‘‘

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة وانھا مخلوقة، وکتاب تفسیر القرآن، باب قولہ فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرة اعین۔ وصحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمھا واھلھا۔

﴿اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ﴾ ’’ایسے ہی لوگوں کا اجران کے رب کے پاس محفوظ ہے۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾﴾ ’’یقیناً اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔‘‘

وہ حساب لینے میں دیر نہیں لگاتا۔ آخری آیت پھر بہت جامع ہے:

آیت۲۰۰ ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا﴾ ’’اے اہل ایمان! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ‘‘

مصابرت بابِ مفاعلہ سے ہے اور اس میں مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک تو ہے صبر کرنا‘ ثابت قدم رہنا‘ اور ایک ہے مصابرت یعنی صبر واستقامت میں دشمن سے بڑھ جانا۔ ایک صبر وہ بھی تو کر رہے ہیں۔ تمہیں آج چرکا لگا ہے تو انہیں ایک سال پہلے ایسا ہی چرکا لگا تھا اور ۷۰ مارے گئے تھے۔ وہ ایک سال کے اندر پھر چڑھائی کر کے آ گئے‘ تو تم اپنا دل غمگین کر کے کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ تمہیں تو ان سے بڑھ کر صبر کرنا ہے‘ ان سے بڑھ کر قربانیاں دینی ہیں‘ تبھی تم حقیقت میں اللہ کے وفادار ثابت ہو گے۔

﴿وَرَابِطُوۡا ۟﴾ ’’اور مربوط رہو۔‘‘

مرابطہ پہرے کو بھی کہتے ہیں اور نظم وضبط (discipline) کی پابندی کرتے ہوئے باہم جڑے رہنے کو بھی۔ غزوۂ اُحد میں شکست کا سبب نظم کا ڈھیلا پن اور سمع وطاعت میں کمی تھی۔ لہٰذا یہاں صبر ومصابرت کے ساتھ ساتھ نظم کی پابندی اور باہم مربوط رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾﴾ ’’اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

یہ آخری اور اہم ترین چیز ہے۔ یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح ملے گی۔ ایسے ہی گھر بیٹھے تم فوز وفلاح سے ہمکنار نہیں ہو سکو گے۔

بارك اللّٰہ لی ولکم فی القرآنِ العظیم۔ ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیمOO

اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی اور مستقبل

انجینئر مختار فاروقی

’’اُمتِ مسلمہ‘‘ آج دنیا میں گوناگوں مسائل کا شکار ہے اور عملاً ﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡكَنَةُ﴾ (رسوائی اور محتاجی ان سے چمٹا دی گئی) کی جیتی جاگتی تصویر بن چکی ہے۔ نہ دنیا ہی میں کوئی عزت و مقام ہے اور نہ مالکِ ارض وسماء کے ہاں کوئی عزت اور درجاتِ جنت۔ اس پستی اور گراوٹ کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم مسلمانوں نے اپنے مقصدِ وجود کو بھلا کر اپنے مقامِ عزوشرف کو اپنے ہاتھوں سے گنوادیا ہے‘ یا بالفاظ دیگر ہم نے آخرت دے کر دنیا خرید لی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ کر امریکہ اور ’’فرینڈز آف پاکستان‘‘ کا سہارا تلاش کر لیا ہے۔ نتیجے کے طور پر‘ حال ہی نہیں‘ مستقبل قریب میں بھی نہ تو کسی شان وشوکت اور جاہ وجلال والے مقام ومرتبہ کی سبیل نظر آ رہی ہے اور نہ اللہ ہی ہم سے راضی ہے کہ آخرت میں بہتری کا یقین اور اطمینان ہو۔

’’اُمت مسلمہ‘‘ کا مقصدِ وجود نبوت ورسالت کے کامل ہونے کے بعد انقطاع کے نتیجے میں ہونے والے خلاء کو پُر کرنا تھا۔ اسی مقصد وحید کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو کھڑا کیا تھا۔

﴿كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

’’(مؤمنو!) تم بہترین اُمت ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور فلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

اُمتوں پر اضمحلال اور بے عملی کے دَور آتے ہی رہے ہیں۔ آخر انسانی معاشرہ ہے۔ لیکن اگر ساری اُمت سو جائے تو بھی کچھ لوگ تو ایسے ہونے چاہئیں جو جاگتے رہیں اور باقی امت کو جگانے کا کام کریں‘ اور اس کو احساسِ زیاں دلاتے رہیں‘ تا آنکہ اللہ تعالیٰ کے اصولوں

اور سنت الٰہی کے مطابق وہ وقت آ جائے کہ اُمت ''زندہ'' اور بیدار ہو جائے۔

﴿وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔''

قرآن مجید میں انسانوں کی اجتماعی بے راہ روی اور آسمانی ہدایت سے بے اعتنائی کو انسانیت کی معنوی موت کہا گیا ہے' جبکہ انسانوں کا آسمانی ہدایت کو قبول کر لینا اور انفرادی زندگی میں تقویٰ وللّٰہیّت' اللہ اور اس کے رسولﷺ کے احکام کی پیروی اور اجتماعی زندگی میں اصولِ حریت واخوت ومساوات کو اپنا کر ''خلافت'' کے نظام کو اختیار کرنے کو معنوی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کیفیت کو حدیث پاک میں احیائے اسلام کا نام دیا گیا ہے۔

یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب کبھی ''اُمتِ مسلمہ'' نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولﷺ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے حقیقی ''اُمتِ مسلمہ'' (فرمانبردار لوگ) کا روپ دھارا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں عزت و وقار بخشا ہے اور تمام جہان والوں پر فضیلت دی ہے' اور جب کبھی اُمتِ مسلمہ نے اپنے مقصدِ وجود کو بھلا دیا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولﷺ کے احکام سے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف امت مسلمہ کو بے وقعت کر دیا اور دوسری طرف شیطانی قوتوں اور بے ضمیر و بے حیا لوگوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا ہے' اور اس سے شیطانی تہذیب وتمدن نے جنم لیا ہے اور گمراہی کے فلسفوں اور غیر منطقی اور بے اصل باتوں کو ہی منطق اور اصل الاصول سمجھ کر اپنانے کی راہ اختیار کی گئی ہے۔

تاریخ عالم میں اس ''حق'' کی پہلی مثال ۶۰۰ ق م سے لے کر ۶۰۰ عیسوی تک کی ہے جبکہ بنی اسرائیل (یہود) نے اپنی شرارتوں کے باعث آگے بڑھ کر انبیائے کرام علیہم السلام کی مخالفت ومخاصمت کا کام شروع کر دیا اور انہوں نے بہت سے پیغمبر اور راہِ حق بتلانے والوں کو قتل کر دیا' اور یوں آسمانی ہدایت کا ایک مصنوعی ''خلا'' اور عملاً ایک مصنوعی انقطاعِ نبوت پیدا ہو گیا' جس کے نتیجے میں شیطانی قوتوں اور بے راہ روی کے حامل انسانوں کو اپنی غیر فطری

اور غیر منطقی باتیں چکنی چپڑی بنا کر پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مزعومہ قتل یا صلیب (یا حقیقی معنٰی میں رفع آسمانی) تک جاری رہا۔ بعد ازاں حکمت خداوندی میں آخری اور کامل نبی ﷺ کی آمد کی تمہید کے طور پر ایک ’’انتظار‘‘ کی کیفیت پیدا کرنا مقصود تھا تو چھ صدیوں کا وقفہ آ گیا۔

یہ چھ صدیاں قبل مسیح علیہ السلام اور چھ صدیاں بعد مسیح علیہ السلام کا دور ہے جس میں آسمانی ہدایت آہستہ آہستہ پس پردہ چلی گئی۔ تورات کو جان بوجھ کر غائب کر دیا گیا اور انجیل کا اصل نسخہ بھی کسی نے چھپا لیا۔ لہٰذا —— اہل علم جانتے ہیں کہ یہی وہ دور ہے جس میں پوری دنیا میں بالعموم فلسفیانہ مذاہب نے جنم لیا اور شیطانی قوتوں نے انگڑائی لی کہ انسانوں کو گمراہ کرنے کا موقع ملا۔ یونان میں افلاطون‘ ارسطو اور اس کی جماعت‘ ایران میں مانی اور ہندوستان میں چانکیہ وغیرہ کے فلسفے وجود میں آئے۔ اور انسانوں کی فطری کمزوریوں اور فطری رجحانات کو exploit کر کے اپنے بے راہ روی کے خیالات اور غیر منطقی باتوں کو منطقی بنا کر پیش کر کے آسمانی ہدایت سے دور کرنے اور انسانوں کو ’’حیوان‘‘ بنانے کا عمل شروع ہو کر پروان چڑھا۔

اسی حق کی دوسری مثال ہدایت کے مہر تاباں اور حق کے علمبردار آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کے دور میں آسمانی ہدایت کے منصّۂ شہود پر آنے اور خلافت راشدہ کے دور مبارک میں سارے عالم میں روشنی کی کیفیت پیدا کرنے کے دَور کی ہے‘ جسے قرآن ’’الضحٰی‘‘ سے تعبیر فرماتا ہے‘ جب فلسفیانہ اور گمراہ کن نظریات جو انسانی فطرت کی مسخ شدہ کیفیت کا نام ہے اور ایسے ہی لوگوں کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں ’’غائب‘‘ ہو گئے اور ﴿جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَهُوۡقًا ﴿۸۱﴾﴾ (الاسراء) ’’حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا‘ بے شک باطل نابود ہی ہونے والا ہے۔‘‘ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اگرچہ دنیا میں خیر و شر کا معرکہ کبھی ختم نہیں ہوا اور ہمیشہ بھیس بدل بدل کر جاری رہا ہے اور ع ’’اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہے لات و منات‘‘ تاریخ انسانی کی چند حرفی تعبیر ہے۔ دورِ خلافتِ راشدہ کے دوران اور اس کے بعد بھی شیطانی قوتوں یا ’’حزب الشیطان‘‘ نے ہار نہیں مانی بلکہ در پردہ اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں (پھونکوں) سے اسلام اور آسمانی ہدایت کی روشنی کو ختم کرنے کا کام پوری مستعدی سے جاری رہا ہے۔ تاہم یہ بات ’’الحق‘‘ ہے‘ جریدۂ عالم پر حرفِ انمٹ کی طرح

ثبت ہے کہ آپ فلسفیانہ مذاہب کے بانیان اور ان کے نمایاں پیروکاروں اور اوّلین شارحین‘ مبلغین کی فہرست ترتیب زمانی کے اعتبار سے دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ:

انسانی جبلتوں اور سفلی خواہشات کی تکمیل کے داعی شیطانی اور ابلیسی نظریات کا وہ دورِ نامسعود جو ۶۰۰ ق م میں بنی اسرائیل کے گھناؤنے جرم ’’قتل انبیاء‘‘ (جس کا تذکرہ بائبل کے عہد نامہ عتیق میں بھی ہے) کی وجہ سے اور تورات کے گم کر دینے کی وجہ سے آسمانی ہدایت کے ’’خلا‘‘ کے دور میں شروع ہو کر پروان چڑھا‘ اور تمام فلسفیانہ مذاہب کے بانیان اسی دور کے ہیں‘ چاہے وہ ہندوستان ہو یا ایران یا یونان اور چین —— اور یہ سلسلہ ۶۰۰ عیسوی تک جاری رہا ہے۔ جبکہ حضرت محمدﷺ کی تشریف آوری کے بعد اور اسلام کے روئے ارضی پر چھائے رہنے کے دور تک (۴۰۰ھ/۱۰۰۰ء) کوئی بڑا فلسفی یا فلسفیانہ مذہب کا بانی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ حقیقت کے قریب ہوگا کہ عقل عام کو آسمانی ہدایت کے غلبہ اور استیلاء کے دور میں حق کے خلاف سوچنے اور دلائل دینے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔

جب مسلمانوں ہی میں ایمانی کیفیات میں مجموعی کمی آ گئی اور جذبات اور احساسات میں وہ شوق باقی نہ رہا اور جذبِ دروں کی کیفیت ختم ہوگئی تو آہستہ آہستہ ان بے راہ روی کے خیالات کو سر اٹھانے کا موقع پھر مل گیا اور —— اس دور میں بھی ارسطو و افلاطون کے خیالات کے پرچارک مسلمانوں میں ہی سامنے آئے ہیں‘ غیر مسلم دنیا میں وہ دم خم نہیں تھا کہ اسلام کی حقانیت کی عمومی فضا میں آسمانی ہدایت کی کاٹ کر کے کوئی باطل نظریہ پروان چڑھا سکے۔ چنانچہ یہی دور ہے جس میں مسلمانوں ہی میں یونانی نظریات کے شارحین اور مبلغین پیدا ہوئے۔ فارابی‘ ابن سینا‘ ابن رشد وغیرہ اسی دور کے بڑے بڑے نام ہیں۔

مسلمانوں میں جب باطنی‘ ایمانی کیفیات میں اضمحلال کے بعد سیاسی زوال آ گیا اور ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد ہوگیا تو اس کے بعد وہ دور ہے کہ غیر مسلم دنیا میں کچھ حرکت ہوئی اور آسمانی ہدایت کے مقابلے میں اپنی سوچ اور آراء کے سامنے لانے کا آغاز ہوا۔

آسمانی ہدایت سے عاری بلکہ مخالف اس مہم جوئی میں سب سے زیادہ سازگار ماحول سپین کی یونیورسٹیوں سے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر آنے والے یورپی دماغوں کو اپنے ملکوں میں ملا‘ جہاں بیٹھ کر انہوں نے انسان کے اپنے فطری رجحانات اور میلانات کے خلاف صرف حیوانی

جذبات اور جبلتوں کے زور پر صرف حیوانیت کے تقاضوں کی تکمیل کی خواہش کے تحت آگے بڑھنے کی سوچ کو ''جدید سوچ'' اور ''احیائے علوم'' کا نام دے کر آگے بڑھایا —— اور ہوتے ہوتے گزشتہ چھ صدیوں کی محنت شاقہ اور بنی اسرائیل کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ کے تعاون سے معاملہ اب یہاں تک پہنچا ہے کہ آج کی مغربی تہذیب جس نے مذہب بیزاری اور خدا ناشناسی کا یہ سفر طے کر کے بیسویں صدی میں انسان کو کامل حیوان بنا دیا ہے اور شرفِ انسانی کے معیار ''شرم و حیا'' اور ''ضمیر'' اور ''نیکی بدی کے احساس'' (moral law) کو بالارادہ اور بامقصد منصوبہ بندی سے ختم کر دیا ہے۔ اور اب گزشتہ نصف صدی میں ایسی دو تین نسلیں (generations) میدانِ عمل میں آ چکی ہیں جو دیکھنے کو اب انسان ہی ہیں' تاہم باقی ہر اعتبار سے **''کالانعام''** جانور اور beast ہیں اور ہر قسم کے اخلاقی ضابطوں سے عاری بلکہ مخالف ہیں۔

یہی نسل ہے جس کے ہاتھ میں آج مغرب کی اقوام کی زمام کار ہے اور معاملات کو چلا رہی ہے۔ اور اگلی نسل یقیناً موجودہ قیادتوں سے بھی زیادہ غیر معقول اور حیوانیت (beastality) میں بے باک ہوگی۔

اس حزب الشیطان یعنی مغربی قوتوں نے سارے کروفر کے ساتھ تیسری ہزاری (3rd millennium) میں قتل انبیاء علیہم السلام اور تورات اور انجیل کو غائب کرنے کی طرح کے اقدامات شروع کیے ہیں اور اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے کئی محاذ کھول دیے ہیں۔ توہین رسالت ایک محاذ ہے' توہین قرآن دوسرا محاذ ہے' اسلامی سزاؤں کی تحقیر اور اس کے خلاف پراپیگنڈہ تیسرا محاذ ہے۔ ''آزادئ نسواں'' کے نام پر تحریک جس سے انسانی شرف کو ختم کر کے جنسی طور پر انسان کو حیوان کی سطح پر لے آیا جائے اور اس کے نتیجے میں چادر اور چار دیواری یا ''خاندان'' کا نظام تباہ کرنا مقصود ہے۔ یہ خاندانی نظام مغرب میں تباہ ہو چکا ہے۔ اب پوری دنیا میں یہ محاذ کھول دیا گیا ہے۔ دیگر مذاہب کا خاندانی نظام اتنا مزاحم نہیں ہے۔ صرف اسلام کا خاندانی نظام اور قانونِ نکاح و طلاق جو ابھی تک جاری و ساری (intact) ہے اس کو مسلسل مختلف حیلوں بہانوں سے تباہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

چوتھا محاذ میڈیا کی سطح پر ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اس مشترکہ عالمی مہم جوئی میں جو

مسلمان غیرت ایمانی و اسلامی سے مزاحمت کرے اسے ''دہشت گرد'' قرار دیا جائے اور نفرت کا نشانہ بنا دیا جائے۔ پوری دنیا کا پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا مسلسل یہی ''قوالی'' کر رہا ہے اور یہی راگ الاپ رہا ہے۔

پانچواں محاذ سیاسی اور عسکری سطح پر ہے کہ مسلم ممالک کی عسکری قوت اور ایٹمی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ لیبیا' عراق' پاکستان پر یلغار جاری ہے اور ان شیطانی اور ابلیسی قوتوں کے ارادے یہ ہیں کہ یہ یلغار ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل تک جاری رہے گی۔

نائن الیون کے واقعہ کے بعد سے جاری جنگ میں امریکہ سمیت سارے یورپی ممالک اور دیگر امریکی اتحادی شریک ہیں۔ گزشتہ سالوں کے دوران تہذیبِ مغرب نے اپنی نیک نامی کے لیے جو چند تمغے بار بار دنیا کے سامنے رکھے وہ جمہوریت' آزادی اور سرمایہ داری کا نظام تھا۔ سوشلزم اور کمیونزم کا سورج ۱۹۸۹ء میں پہلے ہی غروب ہو چکا ہے۔

ان سالوں میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جمہوریت اور جمہوری اقدار کا جس طرح حلیہ بگاڑا ہے اس کی کوئی مثال ملنا مشکل ہے۔ عوام کی رائے' آزادئ رائے' آزادئ اظہارِ رائے' آزادئ مذہب غرض سب اصول طاقِ نسیان ہو گئے ہیں۔ آزادی بھی فوجی بوٹوں کے نیچے کچل دی گئی ہے۔ علامہ اقبال مغربی جمہوریت کی اس صورتحال کا ایک صدی پہلے مشاہدہ کر آئے تھے: ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اور سرمایہ داری (capitalism) گزشتہ چند سالوں کے بحرانوں کے نتیجے میں روبہ زوال ہے اور علامہ اقبال جیسے مردِ قلندر ہی کی پیشین گوئی پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے کہ: ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات!

حالیہ دنوں کی اخباروں کی سرخیاں عراق اور افغانستان میں امریکی اتحادیوں کی شکست فاش اور فرار کا عندیہ دے رہی ہیں اور پاکستان پر غصہ والی نگاہیں بھی در پردہ افغانستان میں

ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تاہم امریکہ جیسی سپر پاور کا ختم ہونا بھی وقت لے جائے گا اور اردو محاورے ''جاٹ مرا تب جانیے جب دسواں ہو'' کے مصداق امریکہ کا افغانستان و عراق سے نکلنا اور سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی اپنے آخری دموں پر ہونے کے باوجود کچھ وقت لے سکتی ہے۔

ان حالات میں امریکہ اور اس کے یورپی اتحادی تو واپس گھروں کو لوٹ جائیں گے اور ع ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'' والی بات پوری ہو جائے گی، مگر ——— امریکہ کے ایک خودساختہ اتحادی بھارت کا معاملہ مختلف ہے اور امریکہ کے بل بوتے پر پاکستان پر برتری دکھانے والے ملک کا حال اگلے چند سالوں میں بڑا قابل رحم ہوگا۔ پہلے بھی بھارت ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء وغیرہ میں روس اور امریکہ کی شہ پر اور اس کی در پردہ حمایت کی وجہ سے ہی جنگ لڑ سکا ہے، مگر اب جو صورت حال پیدا ہوگی وہ بہت غور طلب ہے اور اہل علم اور اربابِ حل وعقد کے لیے آزمائش۔ جو حضرات دینی ذوق رکھتے ہیں اور قرآن مجید اور سیرت النبیﷺ کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان کے لیے اس صورتحال کا تجزیہ ''food for thought'' کے درجے کی چیز ہوگی کہ ——— امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے انخلاء کے بعد بھارت بالکل اسی کیفیت میں چلا جائے گا جو جنگ خندق کے موقع پر ۵ ہجری میں مشرکین مکہ کے اتحادیوں نے پیدا کر دی تھی، مگر جنگ خندق میں مشرکین مکہ اور ان کی اتحادی قوتوں کی ناکامی کے بعد یہود کے قبیلہ بنی قریظہ کی کیفیت دیدنی تھی۔ سارے اتحادی گھروں کو لوٹ چکے تھے اور نبی اکرمﷺ بنی قریظہ کے ٹھکانوں پر فوج لے کر پہنچ چکے تھے۔ بنی قریظہ نے میثاق مدینہ کے باوجود مسلمانوں اور نبی اکرمﷺ کے خلاف مشرکین کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ ان کو مدینہ پر حملہ کے لیے ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کر کے حملہ کی راہ ہموار کی تھی۔ اس فوج کشی میں بنی قریظہ نے ہتھیار ڈال دیے اور ثالثی کے فیصلے میں عبرت ناک سزا پائی جو نافذ العمل ہوئی۔

اسی طرح ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی اکرمﷺ نے صلح حدیبیہ میں مشرکین مکہ سے ۱۰ سال کا معاہدۂ صلح کیا —— تو اب یہود جزیرہ نمائے عرب میں بالکل تنہا ہو گئے اور اس کے باوجود اپنی سازشوں سے باز نہ آنے پر سزا کے مستحق ٹھہرے۔ لہٰذا نبی آخر الزماں حضرت محمدﷺ نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد خیبر پر حملہ کر کے یہود کے اس محفوظ ٹھکانے کو فتح کر لیا اور انہیں تتر بتر کر دیا اور ان کی متحدہ طاقت کو ختم کر کے رکھ دیا۔

بعینہٖ —— یہی صورت حال امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی گھروں کو ''بخیر و عافیت'' واپسی کے بعد ہوگی، جبکہ بھارت تنہا رہ جائے گا اور چاروں طرف سے اس کا کوئی بظاہر حمایتی ملک نہیں ہوگا۔ پڑوسی ممالک یعنی سارک ممالک سے اس کی دشمنی اور ریشہ دوانیوں کی تاریخ عیاں ہے۔ جبکہ مسلمانانِ عالم کا بالعموم اور افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا بالخصوص مورال روس اور امریکہ دو سپر پاورز کے دانت کھٹے کرنے اور انہیں شکست و ریخت سے دوچار کرنے کے باعث انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہوگا۔

لہٰذا —— یہ موقع ہوگا پاکستان کے لیے کہ بھارت کے ساتھ گزشتہ ساٹھ سال کی تاریخی مخاصمت اور اس کی زیادتیوں کا بدلہ لے سکے، اور سقوطِ حیدر آباد، کشمیر پر قبضہ اور پاکستان کو قحط سے دوچار کرنے کے اقدامات کا منہ توڑ جواب دے سکے۔

اس کا نقشہ فرمانِ رسالت ﷺ میں ''غزوۃ الہند'' نامی ایک جنگ اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کی نوید کی صورت میں کھینچا گیا ہے:

> **((عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِیْ اَحْرَزَهُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ: عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَعِصَابَةٌ تَكُوْنُ مَعَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ عليهما السّلام))**(۱)
>
> ''میری اُمت میں سے دو گروہ ایسے ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ آگ سے بچا لے گا: ایک گروہ جو ہندوستان سے جہاد کرے گا اور دوسرا گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا ساتھ دے گا۔''

اغلباً اسی طرح کی سیاسی تبدیلی مشرق وسطیٰ میں بھی مستقبل قریب میں پیدا ہو کر رہے گی جس کی خبر اس فرمانِ رسالت ﷺ میں دی گئی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے بہی خواہان، زعماء، مجاہدین، اکابرین، علماء اور عالی دماغ دانشوروں کو اس آنے والے حالات کی تیاری رکھنی چاہیے۔ ؎

ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے
اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے!

---

(۱) سنن النسائی، کتاب الجہاد، باب غزوۃ الہند۔ و مسند احمد، ح ۲۱۸۹۰۔ عن ثوبان رضی اللہ عنہ

دعوتِ دین: اصول و آداب

عتیق الرحمٰن صدیقی

دعوت سے مراد صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا جائے یا ان تک اسلام کی بات پہنچا دی جائے، بلکہ دعوت اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے زیادہ جامع اور وسیع تر لفظ ہے۔ صرف بات پہنچا دینے کے لیے قرآن حکیم نے بلاغ یا تبلیغ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا اور انہیں اس کی مرضیات کے تابع کرنے کا تمام تر عمل جو حالات کے تناظر میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے، دعوت کہلاتا ہے۔ اس سے مطلوب انسانی زندگی میں منظّم انداز سے ایک مؤثر اور جامع ترین تبدیلی ہے جس سے معاشرہ جادۂ مستقیم پر گامزن ہو جائے اور بندگانِ خدا حقیقی معنوں میں اس کے بندے بن جائیں اور وہ شر و فساد کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، تبشیر سے کام لیں یا تنذیر سے، ترغیب و تلقین کا انداز اپنائیں یا زجر و توبیخ کا اسلوب اختیار کریں، اصحابِ کہف کا سا طریق ان کے پیشِ نظر ہو یا باطل سے رزم آرا ہونے کا عمل، سنتِ نبویؐ کی روشنی میں متعین کردہ تمام راہیں دعوت کے مختلف مراحل کی عکاس ہیں۔

☆ حضور ﷺ کی نبوت عالمگیر ہے

حضور نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت پوری انسانیت کے لیے ہے۔ آپؐ کی بعثت سے لے کر رہتی دنیا تک ہر انسان نہ صرف اس کا مخاطب ہے، بلکہ دینِ حق کو تسلیم کرنے کا مکلّف بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آل عمران: ۸۵)

’’اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے صراحت سے فرمایا کہ:

((كَانَ النَّبِيُّ يُبعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً))(۱)

''مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

آپ ﷺ کا امتیاز یہ ہے کہ آپؐ کی نبوت و رسالت عالمگیر ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس طرح آپؐ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری اور تکمیلی حد کو پہنچ گیا ہے اور اب قیامت تک کوئی نیا نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ بفحوائے قرآنی:

﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط﴾ (الاحزاب: ۴۰)

''بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے خاتم ہیں۔''

☆ اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی

اُمت مسلمہ کی غرضِ تاسیس، اس کا فرضِ منصبی اور اس کی یہ مخصوص ذمہ داری ہے کہ وہ دعوتِ دین کو لے کر آگے بڑھے۔ قرآن نے اُمت مسلمہ کی غرضِ تاسیس بایں الفاظ بیان کی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (البقرة: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم (مسلمانوں) کو ایک بہتر اُمت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے (ہمارے نازل کیے ہوئے دین کے) شاہد بنو اور ہمارا رسول تمہارے لیے شاہد بنے''۔

نیز فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ (آل عمران)

''تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ یہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

گویا اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام نبی کریم ﷺ اپنی زندگی میں کرتے رہے ان کے چلے جانے کے بعد یہ ذمہ داری ان کے پیروکاروں کی ہے۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التیمم، باب قول اللّٰہ تعالٰی فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ۔

کا مطلب صرف یہ نہیں کہ آپ محض بات پہنچا دیں‘ بلکہ اس سے مراد ایسی تبلیغ اور ایسی دعوت ہے جو شہادت کے منشا کی تکمیل کرتی ہو۔ یہ کام ٹھیک اسی طرح کیا جائے جس طرح حضور نبی کریم ﷺ نے کیا۔ دعوت و تبلیغ کا ایک منہج وہ تھا جو آپؐ نے مکی دور میں اختیار کیا جس پر درویشانہ رنگ غالب تھا اور یہ جہاد و قتال سے یکسر خالی تھا۔ اس دور میں جہاد کی اصطلاح کوشش اور جہد سے عبارت رہی۔ مدنی دَور کا منہج اس سے مختلف تھا‘ اسلامی ریاست تشکیل پا چکی تھی اور جد و جہد کا رنگ بدل گیا تھا۔ [۳]

☆ دعوت کے اصول

سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ نے دعوت و تبلیغ کے اصول و آداب چند کلمات میں سمو دیے ہیں۔ فرمایا:

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ؕ﴾ (النحل:۱۲۵)

’’اے نبی‘ اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو‘‘۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے تفسیر قرطبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت ہرم بن حیانؒ کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمائیے تو فرمایا کہ وصیت تو لوگ اموال کی کیا کرتے ہیں‘ وہ میرے پاس ہے نہیں‘ لیکن تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۃ النحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں کہ ان پر مضبوطی سے قائم رہو‘‘۔ (معارف القرآن‘ جلد پنجم)

آیۃ النحل کا تفسیری جائزہ

دعوت الی اللہ کو دعوت الی الخیر کہا گیا اور دعوت الیٰ سبیل اللہ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ سورۃ النحل کی اس آیۂ مبارکہ میں اللہ کی خاص صفت رب کے نبی کریم ﷺ کی طرف اضافت کیے جانے میں یہ اشارہ موجود ہے کہ یہ کام صفتِ ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا جس طرح اللہ نے آپ ﷺ کی تربیت فرمائی آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہیے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

’’اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ الخ سے خود پیغمبر علیہ السلام کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو راستہ

پر کس طرح لانا چاہیے۔ اس کے تین طریقے بتلائے۔ حکمت، موعظت حسنہ اور جدال بالتی ھی احسن۔ **حکمت** سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل و براہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز میں پیش کیے جائیں جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے۔ دُنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی علمی و دماغی ترقیات وحی الٰہی کے بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کر سکیں۔ ''**موعظت حسنہ**'' مؤثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے جن میں نرم خوئی اور دلسوزی کی روح بھری ہو۔ اخلاص، ہمدردی اور شفقت و حسن اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے بسا اوقات پتھر کے دل بھی موم ہو جاتے ہیں، مردُوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں، ایک مایوس اور پژمردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے...... **وجادلهم بالتی هی احسن** میں فرما دیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقہ سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف کے ساتھ بحث کرو، اپنے حریف مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو...... مقصود تفہیم اور احقاقِ حق ہونا چاہیے، خشونت، بداخلاقی، سخن پروری اور ہٹ دھرمی سے کچھ نتیجہ نہیں...... طریق دعوت و تبلیغ میں تم کو خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا چاہیے اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کس نے مانا اور کس نے نہیں مانا۔ (النحل: ۱۲۵۔ تفسیر عثمانی)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کہتے ہیں:

> ''دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہئیں، ایک حکمت دوسرے عمدہ نصیحت۔ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل کے ساتھ اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہیں۔ عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں ان کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے ابھارا جائے...... نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے خیر خواہی ٹپکتی ہو''۔

بہترین مباحثہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو، اس میں کج بحثیاں، الزام تراشیاں اور پھبتیاں نہ ہوں …… بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو، اعلیٰ درجے کا شریفانہ اخلاق ہو، معقول اور دل لگتے دلائل ہوں“ ۔
>
> (النحل: ۱۲۵۔ تفہیم القرآن، جلد دوم)

صاحب معارف القرآن رقم طراز ہیں:

> ”حکمت قرآن حکیم میں بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض ائمہ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآن حکیم، بعض نے قرآن وسنت، بعض نے حجت قطعیہ کو قرار دیا ہے اور روح المعانی نے بحوالہ **بحر المحیط** حکمت کی تفسیر یہ کی ہے: ”**انما الکلام الصواب الواقع من النفس اجمل موقع**“ (روح) یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے۔ صاحب روح البیان نے فرمایا کہ ”حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعے انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کر کے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے …… کہ صراحتاً کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی وہاں اشارات سے کلام کرے یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو“ …… **الموعظة** کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی خیر خواہی کی بات کو ایسی طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لیے نرم ہو جائے …… **الحسنة** کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو …… اور اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقے سے ہونا چاہیے …… **احسان فی المجادلة** صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں اہل کتاب کے بارے میں تو خصوصیت سے قرآن کا ارشاد ہے: ﴿**وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ**﴾ (العنکبوت: ۴۶) اور دوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو ﴿**فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا**﴾ (طٰہٰ: ۴۴) کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا چاہیے“۔ (معارف القرآن، جلد پنجم)

انبیاء و رُسل کی منصبی ذمہ داری

تمام انبیاء اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے اور ان کا تزکیہ و تربیت کرنے پر

مامور رہے ہیں‘ یہ ان کی منصبی ذمہ داری تھی۔ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام نے جب اپنی ذرّیت میں ایک عظیم رسول کے مبعوث کیے جانے کی دعا کی تھی تو ان کے فرائض بھی گنوا دیے تھے‘ یعنی تلاوتِ آیات‘ تعلیم کتاب‘ تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس۔ حضور نبی کریم ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں اس لیے معروف کا حکم دینے اور منکرات سے روکنے کی ذمہ داری ان پر ایمان لانے والوں پر آن پڑی ہے۔ دعوت دینے کا یہ طریقہ وہ اسی انداز میں ادا کرنے کے مکلّف ہیں جو تمام انبیاء و رسل کے پیش نظر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے مشرکین کے استہزاء‘ تضحیک اور طعنہ زنی کے جواب میں کبھی کلمۂ استخفاف کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی ان کے سخت الزامات اور مجادلے کے جواب میں ناشائستہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ حضرت نوح‘ حضرت ہود‘ حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام نے بھی اپنی قوموں کے اتہامات اور ہرزہ سرائیوں کو صبر وعزیمت سے برداشت کیا اور نرمی و ملائمت اور دلیل کے ساتھ ان سے گفتگو کی۔ انبیاء کی عادت یہ تھی کہ وہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے اور جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہوا استفہامیہ انداز میں اسے اپنی طرف منسوب کر لیتے۔ سورۂ یٰسٓ میں فرمایا: ﴿وَمَا لِیَ لَا اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ﴾ (آیت ۲۲) ’’آخر کیوں نہ میں اُس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے؟‘‘ رسول اللہ ﷺ نے شاہِ روم کے نام دعوت کا خط بھیجا تو اس مشترک نقطۂ وحدت (توحید) کا ذکر کیا اور اسے ’’عظیم الروم‘‘ کے لقب سے ملقب کر کے جائز عزت واکرام سے نوازا۔ گویا توحید کے مشترک عقیدہ کی بات کر کے اسے عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

دعوت الی اللہ‘ نہایت مستحسن عمل

قرآن حکیم نے دعوت الی اللہ کے کام کو نہایت مستحسن اور پسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔ فرمایا:

> ﴿وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)
>
> ’’اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں!‘‘

اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر کے اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود بڑی نیکی ہے‘ مگر اعلیٰ وارفع مقام یہ ہے کہ خود اللہ کا ہو رہے اور اس کی حکم برداری کا

اعلان کرے، اس کی پسندیدہ روش پر چلے اور دنیا کو اس کی طرف آنے کی دعوت دے۔ گویا کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ مخالفتوں اور مخاصمتوں کے ماحول میں آدمی کہے کہ میں مسلمان ہوں اور نتائج سے بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور اپنے عمل کو پاکیزہ رکھے۔

حضور نبی محترم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دعوتِ اسلامی دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ ؓ...... فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((مَا بِیْ مَا تَقُوْلُوْنَ ، مَا جِئْتُکُمْ بِمَا جِئْتُکُمْ بِہٖ اَطْلُبُ اَمْوَالَکُمْ، وَلَا الشَّرَفَ فِیْکُمْ وَلَا الْمُلْکَ عَلَیْکُمْ، وَلٰکِنَّ اللّٰہَ بَعَثَنِیْ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا ، وَاَنْزَلَ عَلَیَّ کِتَابًا وَاَمَرَنِیْ اَنْ اَکُوْنَ لَکُمْ بَشِیْرًا وَنَذِیْرًا، فَبَلَّغْتُکُمْ رِسَالَاتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ، فَاِنْ تَقَبَّلُوْا مِنِّیْ مَا جِئْتُکُمْ بِہٖ فَھُوَ حَظُّکُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ))(۱)

''عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے...... رسول ﷺ نے (قریشی مشرک لیڈروں کی بات سن کر) فرمایا: ''مجھے قطعاً حرص نہیں ہے اس چیز کی جو تم پیش کر رہے ہو، میں جو دعوت تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں اس کا یہ مقصد قطعاً نہیں ہے کہ میں مال جمع کرنا چاہتا ہوں یا شرف و عزت کا طالب ہوں یا تم پر حکومت و اقتدار کا بھوکا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے پاس اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ کو اپنی کتاب سے نوازا ہے۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے غلط نظام زندگی کے عواقب و نتائج سے آگاہ کروں اور اس دعوت کے قبول کرنے کے نتیجے میں جو کچھ ملنے والا ہے اس کی خوشخبری دوں تو میں نے اپنے ربّ کا پیغام پہنچا دیا (اور پہنچا رہا ہوں) اور تمہاری خیر خواہی پہلے بھی پیش نظر تھی اور آج بھی۔ اگر تم لوگ اب بھی میری دعوت کو اپنا لو تو یہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمہاری خوش نصیبی ہوگی۔''

دعوت کے اصول۔ حدیث رسول کی روشنی میں

دعوت و تبلیغ کی سرگرمی خاصی احتیاط کی متقاضی ہے۔ حالات کا جائزہ لے کر موقع محل کی مناسبت سے بات کی جانی چاہیے، بے موقع تبلیغ درست نہیں اور موقع کی تلاش سے غفلت بھی صحیح نہیں۔

کَانَ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ مَسْعُوْدٍ ؓ یُذَکِّرُ النَّاسَ فِیْ کُلِّ خَمِیْسٍ، فَقَالَ لَہٗ

---

(۱) البدایة والنھایة، ج۳، ص ۱۵۴، دارالکتب العلمیة، بیروت۔

رَجُلٌ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ لَوَدِدْتُ اَنَّکَ ذَکَّرْتَنَا کُلَّ یَوْمٍ، فَقَالَ: اَمَا اِنَّه یَمْنَعُنِیْ مِنْ ذٰلِکَ اَنِّیْ اَکْرَہُ اَنْ اُمِلَّکُمْ وَاِنِّیْ اَتَخَوَّلُکُمْ بِالْمَوْعِظَةِ کَمَا کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَیْنَا(۱)

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے‘ تو ان سے ایک آدمی نے کہا اے ابوعبدالرحمٰنؒ میری خواہش ہے کہ آپ ہم لوگوں کو روزانہ وعظ و نصیحت کیا کریں۔ انہوں نے کہا روزانہ تقریر کرنے سے جو چیز مجھے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم اُکتا جاؤ گے اور میں تمہیں اُکتا دینا پسند نہیں کرتا‘ میں ناغے دے کر وعظ و نصیحت کرتا ہوں جیسے کہ نبی ﷺ ہم کو ناغے دے کر نصیحت فرماتے تھے‘ اور آپ ایسا اس لیے کرتے کہ ہم لوگ کہیں اُکتا نہ جائیں“۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((**لَا تُبَغِّضُوْا عِبَادَ اللّٰهِ عِبَادَةَ اللّٰهِ**)) (مبسوط‘ امام سرخسیؒ)

”ایسا ڈھنگ اختیار نہ کرو کہ اس کی وجہ سے لوگ اللہ کی بندگی سے نفرت کرنے لگیں“۔

ایک دوسری حدیث میں کثرتِ وعظ کے نقصانات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

عَنْ عِکْرَمَةَ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ: حَدِّثِ النَّاسَ کُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً، فَاِنْ اَبَیْتَ فَمَرَّتَیْنِ، فَاِنْ اَکْثَرْتَ فَثَلَاثَ مِرَارٍ وَلَا تُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَلَا اُلْفِیَنَّکَ تَأْتِی الْقَوْمَ وَهُمْ فِیْ حَدِیْثٍ مِنْ حَدِیْثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَیْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَیْهِمْ حَدِیْثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ، وَلٰکِنْ اَنْصِتْ فَاِذَا اَمَرُوْکَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ یَشْتَهُوْنَهٗ فَانْظُرِ السَّجْعَ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَاِنِّیْ عَهِدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابَهٗ لَا یَفْعَلُوْنَ اِلَّا ذٰلِکَ(۲)

”عکرمہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہر ہفتہ ایک مرتبہ وعظ کیا کرو‘ اگر تمہیں منظور نہیں تو دو دفعہ کر سکتے ہو‘ اور تین مرتبہ سے زیادہ وعظ مت کہنا‘ اور اس قرآن سے لوگوں کو متنفر مت کرنا۔ اور ایسا کبھی نہ ہو کہ تم لوگوں کے پاس پہنچو اور وہ

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب العلم‘ باب من جعل لاھل العلم ایامًا معلومة۔ وصحیح مسلم‘ کتاب صفة القیامة والجنة والنار‘ باب الاقتصاد فی الموعظة۔

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب الدعوات‘ باب ما یکرہ من السجع فی الدعاء۔

> اپنی کسی بات میں مشغول ہوں اور تم اپنا وعظ شروع کر دو اور ان کی بات کاٹ دو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو ان کو وعظ و نصیحت سے متنفر کر دو گے' بلکہ ایسے موقع پر خاموشی اختیار کرو اور جب ان کے اندر خواہش دیکھو اور وہ تم سے مطالبہ کریں تو پھر وعظ کہو۔ اور دیکھو مسجع مقفیٰ عبارتیں بولنے سے بچو' کیونکہ میں نے نبیﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام ؓ کو دیکھا ہے کہ وہ تکلف کے ساتھ عبارت آرائی نہیں کرتے تھے''۔

سامعین جس قسم کے ہوں اسی لحاظ سے زبان و بیان اختیار کرنا چاہیے۔ فلسفیانہ انداز میں بولنا اور مشکل الفاظ و تراکیب کا استعمال دعوت کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ: **كَانَ كَلَامُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَلَامًا فَصْلًا يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ سَمِعَهُ**(۱) ''رسول اللہﷺ کی گفتگو بالکل واضح ہوتی تھی جسے ہر سامع سمجھ سکتا تھا''۔ حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ: ((**اِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ اَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ**))(۲) ''نبی کریمﷺ جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو اس کو تین دفعہ دہراتے تاکہ وہ بات لوگوں کی سمجھ میں اچھی طرح آ جائے''۔

لوگوں کے جذبات و رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھ کر بات کی جانی چاہیے:

قال عَلِیٌّ ؓ: اِنَّ لِلْقُلُوْبِ شَهَوَاتٍ وَاِقْبَالًا وَاِدْبَارًا فَاْتُوْهَا مِنْ قِبَلِ شَهَوَاتِهَا وَاِقْبَالِهَا فَاِنَّ الْقَلْبَ اِذَا اُكْرِهَ عَمِیَ (کتاب الخراج' ابویوسف)

> ''حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ دلوں کی کچھ خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں' اور کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار رہتے ہیں اور کسی وقت اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ تو لوگوں کے دلوں میں ان کے میلانات کے اندر سے داخل ہو اور اُس وقت اپنی بات کہو جب کہ وہ سننے کے لیے تیار ہوں' اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے (اور بات قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے)۔''

داعی حق ہر لحظہ چوکنا رہے' اپنے قول و فعل پر نگاہ رکھے' اس کے دل اور زبان میں رفاقت موجود رہے' اس کا مباحثہ اور تبادلۂ خیال بہترین ہو' کج بحثی سے دامن بچائے' نامساعد حالات میں بھی مایوس نہ ہونے پائے' مخالفتوں کے ہجوم میں اپنی حکمت عملی کا جائزہ لے اور اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق **اَقِیْمُوا الدِّیْنَ** کا علَم تھامے رہے۔ اس کا دھیان دعوت و

---

(۱) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب الھدی فی الکلام۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من اعاد الحدیث ثلاثاً لیفھم عنه۔

اصلاح‘ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر رہے اور فکر و عمل میں توسط و اعتدال کا حسن قائم رکھے۔ جھوٹی اور موضوع روایات کو اپنی دعوت کی بنیاد نہ بنائے۔ نہایت جچے تلے انداز میں صحیح‘ پختہ اور مستند بات کرے۔ حضور نبی کریمﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِﷺ : ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ اِسْرَاءِ یْلَ وَلَا حَرَجَ ، وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ))[۱]

”رسول اللہﷺ نے فرمایا: میری طرف سے لوگوں کو پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسراءیل سے روایت کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانہ بنا لے“۔

اخذ و استفادہ

- ☆ معارف القرآن‘ جلد پنجم‘ مولانا مفتی محمد شفیعؒ
- ☆ تفہیم القرآن‘ جلد دوم و چہارم‘ سید مودودیؒ
- ☆ تفسیر عثمانی‘ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ☆ دعوت کا منہج کیا ہو؟ از محمد قطبؒ
- ☆ راہِ عمل‘ جلیل احسن ندوی
- ☆ ترجمان الحدیث اوّل‘ سید محمود حسن
- ☆ حیاتِ رسولِ اُمی۔ از خالد مسعود
- ☆ زادِ راہ‘ جلیل احسن ندوی

---

[۱] صحیح البخاری‘ کتاب احادیث الانبیاء‘ باب ما ذکر عن بنی اسراءیل۔

آخرت

قرآن وحدیث کے آئینے میں

فاروق حمید☆

آخرت کے لغوی معنی ہیں بعد میں آنے والی (زندگی)۔ اس کے مقابلے میں لفظ بولا جاتا ہے ''دنیا'' جس کے معنی ہیں 'قریب کی چیز' یعنی یہ دنیا جس کو ہم برت رہے ہیں، قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ اور آخرت چونکہ اس کے بعد آئے گی اس لیے اُسے بعد کی چیز قرار دیا گیا ہے۔ اصطلاحی مفہوم میں آخرت سے مراد یہ ہے کہ:

(۱) ایک دن ایسا آئے گا، جس کا علم صرف اور صرف اللہ ربّ العالمین کو ہے، جس دن یہ پوری کائنات اور تمام مخلوقات فنا ہو جائیں گی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿**اِلَیۡهِ یُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَةِ**﴾ (حٰم السجدة:٤٧)

''قیامت کے علم کا حوالہ اللہ ہی کی طرف دیا جا سکتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿**اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی⑮**﴾ (طٰهٰ)

''یقیناً قیامت تو آ کر رہنے والی ہے، میں اُس کا وقت لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر شخص اپنی کوشش کے مطابق بدلہ پائے۔''

(۲) اُس کے بعد تمام انسانوں اور جنوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا، اِس کا نام حشر ہے۔ تمام جن و انس اس دنیا میں گزارے ہوئے عرصہ کے دوران جو اعمال کیے ہیں ان کے حساب و کتاب کے لیے اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿**اِلَیۡهِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ**﴾ (یونس:٤)

''تم سب کو بالآخر اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ برحق ہے۔''

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، ایف جی کالج، بہاولپور

(۳) جس کے اعمال اچھے ہوں گے اُسے انعام ملے گا اور جس کے اعمال برے ہوں گے اسے سزا ملے گی:

﴿اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ (۱۳) وَّاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ (۱۴)﴾ (الانفطار)

''بے شک نیک لوگ جنت میں ہوں گے' اور برے لوگ جہنم میں''۔

(۴) اُس روز ہر شخص کو پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہ ہوگی:

﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ (۷) وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ (۸)﴾ (الزلزال)

''جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا''۔

(۵) کسی شخص کے اعمال کا ذمہ دار دوسرا شخص نہیں ہوگا' بلکہ ہر شخص تنہا اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوگا اور تنہا جوابدہ ہوگا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَكُلُّهُمۡ اٰتِیۡهِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فَرۡدًا (۹۵)﴾ (مریم)

''اور ہر کوئی قیامت کے دن اللہ کے سامنے اکیلا اکیلا حاضر ہوگا۔''

﴿وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۚ﴾

(الانعام: ۱٦٤)

''ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اُس کا ذمہ دار وہ خود ہے' اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔

اہمیت

اسلام کے بنیادی عقائد پر ایمان لانا فرض ہے۔ اگر اُن میں سے کسی ایک پر بھی ایمان نہ ہو تو نجات ممکن نہ ہوگی۔ انہی میں سے آخرت کا دن ہے جس پر ایمان لانا فرض ہے۔ اور تمام عقائد میں سے مؤثر ترین عقیدہ ''عقیدۂ آخرت'' ہے' جو انسان کو سیدھی راہ اختیار کرنے میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر اُسے توحید کے ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے اور پورے قرآن کریم میں آخرت کے احوال و کیفیات کو انتہائی مؤثر دلائل اور بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ''القِیٰمۃ'' نام کی ایک سورت بھی قرآن میں موجود ہے جس کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایسے مضامین آ گئے ہیں جس سے قیامت کا پورا نقشہ اِس طرح سامنے آ جاتا ہے کہ عقل

وادراک سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں (اس سورہ کا مطالعہ لازماً کر لیا جائے)۔ نبی کریم ﷺ نے مکی زندگی کے تیرہ سال لوگوں کو عقیدۂ توحید و آخرت سمجھانے میں ہی صرف کر دیے‘ کیونکہ اسلامی نظامِ زندگی کی انفرادی و اجتماعی عمارت کھڑی ہی اس نبیاد پر ہے۔ جزاوسزا کے تصور کے بغیر کوئی کام بھی اخلاص اور دیانت داری سے نہیں کیا جاسکتا۔ عقیدۂ آخرت انسان کو شتر بے مہار اور مطلق العنان نہیں بننے دیتا بلکہ جلوت وخلوت میں یہ احساس جگائے رکھتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار شخص ہے۔ اس طرح وہ نیکی کی رغبت اور برائی سے نفرت کرتا ہے اور اس سے اس کا احساسِ جواب دہی تازہ رہتا ہے۔ اگر یہ عقیدہ نہ ہو تو انسانیت ظلم و جبر سے بھر جائے‘ انسان اور جانور میں بنیادی فرق یہی ہے کہ انسان اللہ کے ہاں جواب دہ ہے اور جانور نہیں۔ اور جو انسان اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہی سے بالاتر سمجھتا ہے درحقیقت وہ جانور سے بھی بدتر ہے:

﴿لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ۫ وَلَهُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِهَا ۫ وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾﴾

(الاعراف)

”اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں‘ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں‘ اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں“۔

یہ دنیا دار العمل اور دارا لامتحان ہے۔ آخرت دار الجزاء اور دار النتائج یعنی نتیجے (Result) کی جگہ ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے‘ آخرت دُنیاوی زندگی کا لازمی جزو اور تسلسل ہے۔ جس طرح سکے کے دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح آخرت زندگی کا دوسرا رخ ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ آخرت بھی زندگی کی ایک جولان گاہ ہے۔

عقلی استدلال

دنیا میں جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ خود غرضی ونفس پرستی میں ڈوب کر تہذیب وشرافت اور عدل وانصاف کے تقاضوں کی دھجیاں بکھیر کر انسانی معاشرے میں جنگل کا قانون رائج کر دیتے ہیں اور وہ انسانوں کے بنیادی حقوق کو تسلیم کرنے سے عملاً انکار کر دیتے ہیں(۱)۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے البقرۃ: ۲۷و۲۰۵۔

اسی طرزِ عمل سے عقلِ انسانی تقاضا کرتی ہے کہ ’’آخرت‘‘ لازماً برپا ہونی چاہیے تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے‘ کیونکہ انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ نیک عمل کا اچھا بدلہ ملے اور برے عمل کی سزا ملے‘ لیکن اعمال کے پورے پورے نتائج کا مرتب ہونا اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ ساری زندگی نیکی اور پاکیزگی کے ساتھ گزار دیتے ہیں لیکن دنیا سے انھیں کوئی صلہ نہیں ملتا بلکہ انہیں اذیتیں ہی ملتی رہتی ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں اس کی شہادت دیتی ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ ساری زندگی دوسروں پر مظالم ڈھاتے رہتے ہیں‘ وہ ہزارہا انسانوں کو قتل کرتے ہیں۔ اوّل تو وہ دنیا میں پکڑے ہی نہیں جاتے‘ اگر پکڑے جائیں تو اُنہیں پوری سزا دینا ممکن ہی نہیں ہے۔ اُنہیں قتل کے بدلے قتل کیا جائے تو وہ تو ایک قتل کا بدلہ ہوا‘ باقی جتنا فساد فی الارض ہوا اس کی سزا انہیں کیسے ملے گی؟ اس لیے آخرت انسانیت کے لیے اللہ کی گراں قدر رحمت ہے۔ اگر آخرت (Day of Judgement) نہ ہوتی تو اللہ کی رحمت اور انصاف کی تکمیل نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ بات اللہ کی شانِ عدل وحکمت سے بہت بعید ہے کہ وہ ظالموں اور نیک لوگوں کے درمیان فرق نہ کرے اور اُن سے ایک جیسا برتاؤ کرے:

﴿اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ قفہ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ (القلم)

’’یقیناً متقین کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت بھری جنتیں ہیں۔ کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو؟‘‘

معلوم ہوا کہ جزا وسزا انسانیت کی ضرورت ہے۔(۲)

عقیدۂ آخرت صرف نظری یا خیالی فلسفہ نہیں ہے بلکہ ایک اٹل حقیقت ہے جو ہر صورت پیش آنے والا ہے: ﴿اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا ﴿۱۷﴾﴾ (النبأ) ’’بے شک فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے‘‘۔ کیونکہ موت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے جو کسی وقت بھی آ سکتی ہے اور ہر ذی روح نے موت کا مزہ چکھنا ہے: ﴿کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ ﴿۲۶﴾﴾ (الرحمٰن) ’’ہر کوئی جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والا ہے۔‘‘ اور سب سے غیر حقیقی چیز زندگی ہے جو کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ جس طرح افراد زندگی گزار کر مر جاتے ہیں اور قومیں اپنی اپنی طاقت دکھا کر فنا

---

(۲) دیکھئے الانعام: ۳۲ اور النحل ۳۸‘ ۳۹۔

ہوجاتی ہیں، جس کی تاریخ شہادت دیتی ہے، بالکل اسی طرح ایک دن یہ پوری کائنات بھی اللہ کے قانون کے مطابق فنا ہوجائے گی۔ اس چیز کو وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو آخرت پر اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتے۔

اُمتِ مسلمہ کی حالت

اُمتِ مسلمہ بزبانِ قال آخرت کا اقرار تو کرتی ہے لیکن بزبانِ حال آخرت کے سلسلے میں مجرمانہ غفلت کا شکار ہے۔ ہر مسلمان مال و دولت کے حرص اور دنیاوی کاموں میں اس قدر منہمک ہے کہ اُسے آخرت یا موت بہت دُور نظر آتی ہے (٣) جبکہ قرآن حکیم میں یہ اعلان موجود ہے:

﴿یٰۤاَیُّھَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ ۚ﴾(الانشقاق)

''اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اُس سے ملنے والا ہے''۔

اور پھر وہ مبتلا کس فتنے میں ہے؟ جس سے نبی کریم ﷺ نے خبردار بھی کیا تھا کہ:

((اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ فِتۡنَۃٌ وَفِتۡنَۃُ اُمَّتِی الۡمَالُ))(٤)

''ہر اُمت کا ایک فتنہ ہے اور میری اُمت کا فتنہ مال ہے''۔

اور اس دُنیا کو مؤمن کے لیے ایک قید خانہ قرار دیا جس سے بچنے کی تلقین فرمائی:

((اَلدُّنۡیَا سِجۡنُ الۡمُؤۡمِنِ وَجَنَّۃُ الۡکَافِرِ))(٥)

''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔''

کوئی صاحبِ عقل قید خانے سے جی نہیں لگاتا اور نہ ہی بہت زیادہ ساز و سامان اکٹھا کرتا ہے۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن یہاں سے چھوٹ کے جانا ہے۔ وہ دن گنتا رہتا ہے کہ کب اس سے رہائی ہوگی۔ مؤمن نے بھی تو اپنے اصل گھر جنت میں جانا ہے، اُس کے لیے کیا زادِ راہ جمع کیا ہے، یہ اس کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی:

((کُنۡ فِی الدُّنۡیَا کَاَنَّکَ غَرِیۡبٌ اَوۡ عَابِرُ سَبِیۡلٍ))(٦)

---

(٣) تفصیل کے لیے سورۃ التکاثر، الھمزۃ اور العٰدیٰت کا مطالعہ کریں۔

(٤) سنن الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء ان فتنۃ ھذہ الامۃ فی المال۔

(٥) سنن الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر۔

(٦) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب ......

’’دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر‘‘

صاف ظاہر ہے کہ کوئی اجنبی یا مسافر عارضی جگہ پر بہت زیادہ عیش و عشرت کے سامان اکٹھے نہیں کرتا۔ اُسے خوب معلوم ہے کہ چند گھنٹوں یا دنوں میں وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ دورانِ سفر وہ صرف انتہائی ضرورت کی چیزوں سے واسطہ رکھتا ہے۔ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اسلام ضرورت کی چیزوں سے منع کرتا ہے۔ وہ تو نفس کی اُس کیفیت کی مذمت کرتا ہے جس میں انسان پورے کا پورا دنیا و اسبابِ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر مقصدِ حقیقی کو بھول جاتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں دنیا اور آخرت کا موازنہ (comparison) بہت فکر انگیز ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِالْعِبَادِ ⑮﴾

’’لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس -- عورتیں‘ اولاد‘ سونے چاندی کے ڈھیر‘ نشان زدہ گھوڑے‘ مویشی اور زرعی زمینیں -- بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں‘ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں اُن کے لیے ان کے ربّ کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں‘ وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی‘ پاکیزہ بیویاں اُن کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے‘‘۔

نبی آخر الزمان الصادق والمصدوق ﷺ کی نظر میں دُنیا کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا:

((وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ اِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهٗ هٰذِهٖ (وَاَشَارَ يَحْيٰى بِالسَّبَّابَةِ) فِي الْيَمِّ‘ فَلْيَنْظُرْ بِمَ تَرْجِعُ؟))(٧)

’’اللہ کی قسم‘ آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی مثال ایسی ہی ہے جیسے تم میں سے کوئی

---

(٧) صحیح مسلم‘ کتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها‘ باب فناء الدنيا وبيان الحشر يوم القيامة۔

اپنی یہ انگلی (انگشتِ شہادت) دریا میں ڈالے۔ پھر وہ دیکھے کہ وہ اپنے ساتھ کیا نکال لاتی ہے؟''

گویا جو بوند پانی انگلی کو لگا رہ گیا وہ دنیا کی زندگی ہے' اور وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا آخرت کی زندگی ہے۔ ایک بوند پانی کی کوئی نسبت بنتی ہے اُس دریا سے؟ کم عقلی ہوگی اگر ایک قطرے (چندروزہ دنیاوی زندگی) کی خاطر دریا (ہمیشہ کی زندگی) کو قربان کر دیا جائے۔ اور انسان جس مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہوکر اللہ کی ناراضگی مول لیتا ہے اس کا حاصل کیا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((یَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِیْ مَالِیْ' اِنَّمَا لَہٗ مِنْ مَالِہٖ ثَلَاثٌ : مَا اَکَلَ فَاَفْنٰی اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی اَوْ اَعْطٰی فَاقْتَنٰی ' وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَھُوَ ذَاھِبٌ وَتَارِکُہٗ لِلنَّاسِ))(۸)

''بندہ کہتا ہے میرا مال' میرا مال' حالانکہ اس کا مال صرف تین چیزیں ہیں: جو کھایا اور فنا کیا' جو پہنا اور پرانا کیا' اور جو اللہ کی راہ میں دیا وہ جمع کیا۔ اس کے علاوہ وہ سب کچھ چھوڑ کے جانے والا ہے جو اس کے وارثوں کا ہے''۔

جن وارثوں کے لیے انسان اپنی آخرت داؤ پر لگا دیتا ہے وہ اُس دن کسی کام نہ آئیں گے بلکہ اس سے دُور بھاگیں گے۔

﴿یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍۭ بِبَنِیْہِ ⑪ وَصَاحِبَتِہٖ وَاَخِیْہِ ⑫ وَفَصِیْلَتِہِ الَّتِیْ تُـْٔوِیْہِ ⑬ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ ثُمَّ یُنْجِیْہِ ⑭ کَلَّا ؕ اِنَّھَا لَظٰی ⑮ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی ⑯ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی ⑰ وَجَمَعَ فَاَوْعٰی ⑱﴾ (المعارج)

''مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے' اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔ ہرگز نہیں' وہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ ہوگی' جو گوشت پوست کو چاٹ جائے گی۔ پکار پکار کر اپنی طرف بلائے گی ہر اُس شخص کو جس نے حق سے منہ موڑا اور پیٹھ پھیری' اور مال جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا''۔

---

(۸) صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق۔

اللہ کا نظامِ انصاف

ان آیات کی روشنی میں ہر شخص اپنا اپنا جائزہ لے کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اللہ کی گرفت اور اس کا قانونِ انصاف اتنا مضبوط اور اٹل (severe & ultimate) ہے کہ کوئی مجرم بچ نہیں سکتا(۹)۔ اور اس کی جانچ پڑتال اتنی مکمل اور باریک ہے کہ انسان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جرم بھی اُس سے چھپ نہیں سکتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ⑨﴾ (الطارق) ''جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی''۔ ﴿وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوۡرِ ⑩﴾ (العدیت) ''سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے جانچ پڑتال کی جائے گی''۔

سید مودودیؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تشریح کی ہے:

> ''یعنی دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو افکار و خیالات اور ظاہری اعمال کے پیچھے جو باطنی محرکات (motives) چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیے جائیں گے اور اُن کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور برائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو جو کام انسان نے کیے وہ کس نیت سے اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف اللہ کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہوسکتا........... دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے، یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے۔(۱۰)

اللہ کی گرفت سے کوئی شخص نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ ہی چھپ سکتا ہے(۱۱)۔ کیونکہ اُس نے کسی غلطی کے امکان سے خالی (fool-proof) انتظامات کر رکھے ہیں۔

(**۱**) کراماً کاتبین ہر انسان کا تحریری صورت میں پورا ریکارڈ مرتب کر کے رکھ دیں گے جو اُسے تھما دیا جائے گا(۱۲) ﴿اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا﴾ (الاسراء) ''پڑھ اپنا نامۂ اعمال! آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے''۔

---

(۹) دیکھئے سورۂ ھود، آیات ۱۰۲ تا ۱۰۷۔

(۱۰) تفہیم القرآن، ج ۶، ص ۴۳۱۔

(۱۱) دیکھئے الرحمٰن: ۳۳۔

(۱۲) دیکھئے الانفطار: ۱۱۔

(**۲**) اس ریکارڈ سے اگر کوئی انکار کرے گا تو اس کے اپنے اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے۔(۱۳)

(**۳**) پھر زمین اپنے اوپر ہونے والے تمام واقعات بیان کرے گی (۱٤)۔ یعنی تصویری (visual) ریکارڈ سامنے رکھ دے گی جس سے انکار کی گنجائش نہ ہوگی۔

ان زبردست انتظامات کے بعد تو کوئی مجرم بچ ہی نہیں سکتا۔ دنیا میں مجرم کو چھڑوانے کے لیے عام طور پر چار طریقے اختیار کیے جاتے ہیں:

(**۱**) کسی کا جرم کوئی اور شخص قبول کر لیتا ہے اور اصل مجرم چھوٹ جاتا ہے۔

(**۲**) رشوت دے کر مجرم چھڑا لیا جاتا ہے۔

(**۳**) سفارش کے ذریعے مجرم بچ جاتا ہے۔

(**٤**) مجرم کے ساتھی حملہ کر کے اپنے ساتھی کو چھڑوا لے جاتے ہیں۔

جبکہ اللہ کی عدالت انصاف میں نہ یہ دنیاوی طریقے کام آئیں گے اور نہ ہی کوئی اور طریقہ ایسا ہے جس سے مجرم چھوٹ سکے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿١٢٣﴾﴾ (البقرۃ)

''اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا' نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا' نہ کوئی سفارش ہی آدمی کو فائدہ دے گی اور نہ مجرموں کو کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی''۔

اس صورت حال کے ہوتے ہوئے انسان کی غفلت اور لاپرواہی یا تو کم عقلی ہے یا انتہائی بے حسی کہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیے جا رہا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿٦﴾﴾ (الانفطار)

''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے ربّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا؟''

فکرِ آخرت

لازم ہے کہ غفلت و لاپرواہی کو چھوڑ کر آخرت کے لیے زادِ راہ اور پونجی اکٹھی کر لی

---

(۱۳) دیکھئے یٰس:٦٥' حٰم السجدۃ: ٢٠۔٢١۔

(۱٤) دیکھئے الزلزال:٤۔

جائے اور اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ساری توانائیاں صرف کر ڈالی جائیں۔ ہر شخص آخرت کی شدید فکر کرے کیونکہ اصل کامیابی تو آخرت کی ہے(۱۵)۔ اگر وہاں ناکامی ہوئی تو سوائے حسرت و پچھتاوے کے کوئی کچھ نہ کر سکے گا(۱۶) اور نہ ہی دوبارہ دنیا میں آ کر اصلاح کرنے کا موقع ملے گا۔ فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (الحشر)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے؟ اللہ سے ڈرتے رہو' اللہ یقیناً تمہارے اُن سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو''۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انسان اپنے قدم نہ ہٹا سکے گا جب تک اُس سے پانچ سوال نہ پوچھ لیے جائیں گے: (۱) اپنی عمر کہاں کھپائی؟ (۲) جوانی کن کاموں میں گزاری؟ (۳) مال کیسے کمایا؟ (۴) اور اس کو (اُس مال کو) کہاں خرچ کیا؟ (۵) علم (جو تمہیں دیا گیا تھا) اس پر کتنا عمل کیا؟''(۱۷)

گویا آخرت کے امتحان کو ان پانچ سوالوں میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر ہر شخص ان پانچ سوالوں کو بہت اچھی طرح تیار کر لے تو ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔ یہ دراصل آخرت کے امتحان کا پرچہ ہی دنیا میں بتا دیا گیا ہے۔

فکر آخرت پیدا کرنے کے طریقے

اصل سہارا تو اللہ کی رحمت اور عفو و درگزر کا ہے' تاہم انسان کو جدوجہد کرنے کا حکم ہے(۱۸) اگر مندرجہ ذیل طریقوں پر عمل کیا جائے تو بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں:

(۱) توبہ واِستغفار

اپنے آپ کو بدلنے کا عزمِ صمیم (صرف خواہش نہیں) کر لیا جائے۔ اللہ سے سابقہ

---

(۱۵) دیکھئے آل عمران:۱۸۵' النساء:۱۳' الصف:۱۲ اور التغابن:۹۔

(۱۶) دیکھئے الفجر:۲۳'۲۴۔

(۱۷) سنن الترمذی' ابواب صفة القيامة 'باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

(۱۸) دیکھئے الشوریٰ:۲۰۔

کوتاہیوں کی تہ دل سے معافی مانگی جائے۔ آئندہ کے لیے پاکیزہ زندگی شروع کردی جائے اور صبح و شام اِستغفار کو زندگی کا معمول بنایا جائے۔ رسول کریمﷺ روزانہ سو سو مرتبہ اپنے مالک سے اِستغفار کرتے تھے' حالانکہ آپﷺ معصوم تھے اور ہم تو واقعی سیاہ کار ہیں۔ بنا بریں ہمیں زیادہ اِستغفار کرنا چاہیے۔ ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ ورجوع سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے''۔(۱۹)

(۲) ذکر الٰہی

اہل ایمان کے ساتھ خشوع وخضوع سے عبادات واعمال صالحہ پر دوام اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جائے۔ غفلت کا علاج نماز وذکر' حبِ مال کا علاج زکوٰۃ وانفاق' ضبطِ نفس کے لیے روزہ اور تکبر وحق تلفی کا علاج خدمت خلق ہے۔(۲۰)

(۳) مطالعۂ قرآن کریم

انسان کی تعمیر سیرت وکردار کے لیے قرآن سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس سے تعلق کو گہرا کیجیے اور مطالعہ قرآن کا مستقل معمول بنائیے۔ مکی سورتیں اور خاص طور پر آخری پارہ تو فکرِ آخرت پیدا کرنے کے لیے بہت ہی کارگر ہے' جس میں مشاہداتِ عالم کے دلائل سے اس موضوع کو مؤثر طریقے پر اجاگر کیا گیا ہے۔

(۴) مطالعۂ حدیث

حدیث کا مطالعہ بھی دل میں گداز اور رِقت پیدا کرتا ہے' خاص طور پر کتاب الرقاق اور کتاب الزہد کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

(۵) مطالعہ سیرت النبیﷺ وسیرت الصحابہؓ

نبی کریمﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی سیرت کا مطالعہ اس زاویۂ نظر سے کیا جائے کہ وہ کس طرح آخرت کی فکر اور تیاری کرتے تھے۔

(۶) زیاراتِ قبور

اپنی موت کو یاد کرنے اور آخرت کی فکر کے لیے زیاراتِ قبور ایک بہترین عملی (practical)

---

(۱۹) صحیح مسلم' کتاب التوبۃ' باب فی الحض علی التوبۃ والفرح۔

(۲۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں الرعد: ۲۰ تا ۲۵۔

درس ہے جس سے دنیا کی بے ثباتی اور اپنی آخری منزل کا یقین ہوتا ہے۔

حسن البناء شہیدؒ لکھتے ہیں:

> ’’شیخ محمد ابوشوشہ کا ہم پر بڑا احسان ہے...... کہ وہ ہمیں قبرستان لے جاتے ...... پھر وہ ہمیں کھدی ہوئی قبریں دکھاتے اور ہمیں یاد دلاتے کہ بالآخر ہم اسی تاریک غار کے اندر بسیرا کریں گے۔ بعض اوقات وہ ہم میں سے کسی ایک کو حکم دیتے کہ قبر میں اُتر جاؤ اور چند گھڑی وہاں لیٹ کر اپنا انجام یاد کرو۔ قبر کی تاریکی (تنہائی) اور قبر کی وحشت کا تصور کرو۔ ابوشوشہ خود بھی زار و قطار روتے اور ہماری آنکھیں بھی اشک بار ہو جاتیں۔ ہم بڑے خشوع کے لمحات میں، عجیب ولولے اور حضوریٔ قلب کے ساتھ اور ندامت و عزم کے جذبات میں مستغرق ہو کر توبہ کو تازہ کرتے۔(۲۱)

---

(۲۱) حسن البناء شہید کی ڈائری، ص ۱۳۹۔

پاکیزہ معاشرہ‘ ایمانِ اعلیٰ اور منصبِ خلافت

سورۃ النور کی روشنی میں

محمد رشید عمر

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵۵)﴾ (النور)

’’اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے‘ اور ان کے لیے ان کے دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے‘ اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن میں بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔‘‘

انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ عبادتِ رب ہے‘ جبکہ ربّ العالمین نے انسان کو جو اعلیٰ ترین منصب اس زمین پر عطا فرمایا ہے وہ منصبِ خلافت ہے۔ فرشتوں کے سامنے باری تعالیٰ نے جب انسان کی تخلیق کا منصوبہ ظاہر فرمایا تو یہ منصب اسی وقت عطا کر دیا تھا۔ فرمایا:

﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ (البقرۃ: ۳۰)

’’بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔‘‘

اس منصب کی بدولت انسان کو تمام زمینی اور آسمانی مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے۔ سورۃ

النور کی متذکرہ بالا آیتِ مبارکہ میں اس منصب کے عطا کرنے کی بشارت کو ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ اگر انسان ان شرائط کو پورا نہیں کرتا تو اس کی حیثیت ﴿كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۷۹) ’’جانوروں جیسے بلکہ ان سے بھی گئے گزرے‘‘ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ وہ منصب خلافت کا اہل نہیں رہ جاتا۔

خلافت وہ منصب ہے جس کے ذریعے انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کا فریضہ انجام دیتا ہے، جس کے نتیجے میں انسانی معاشرہ میں عدل، احترامِ آدمیت، اقتصادی آسودگی اور امن کا دور دورہ ہوتا ہے اور ایسے نظامِ حیات کو استحکام ملتا ہے جس میں انسان اپنی زندگی کے مقصدِ اعلیٰ یعنی اپنے ربّ کی بندگی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ خلیفۂ وقت خادمِ اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس منصب پر فائز ہو کر اس کی گردن غرور و تکبرّ سے اکڑ نہیں جاتی بلکہ وہ اپنے آپ کو عام انسان سمجھتا ہے۔ خدمت خلق کی بھاری ذمہ داری سے اس کی ہڈیاں کڑکڑاتی رہتی ہیں اور وہ ذمہ داری کے حوالے سے جواب دہی کے احساس میں اپنے مالک کے سامنے لرزاں اور ترساں رہتا ہے۔ وہ اپنے عوام کے لیے نہایت شفیق و رحیم اور اللہ کے احکام کی تنفیذ میں سخت ہوتا ہے۔ وہ حیا اور قضاء کا پیکر ہوتا ہے۔ اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس کے زیرانتظام خطہ میں اگر کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو اللہ کے حضور اس سے پوچھا جائے گا۔ اس نظام میں جہاں انسانوں کی دنیاوی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے وہاں روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ماحول بھی میسر آتا ہے۔

اس منصب کے استحقاق کے لیے باری تعالیٰ نے دو شرائط بیان فرمائی ہیں:

(۱) ایمان (۲) عملِ صالح

اسلام میں عملِ صالح کا تعلق بھی ایمان کے ساتھ ہے۔ از روئے فرمانِ نبویؐ:

((اِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) (متفق علیہ)

’’اعمال (کی قبولیت) کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔‘‘

تو بنیادی حیثیت ایمان کو حاصل ہے۔ متذکرہ بالا خوبیوں اور صفات والی خلافت کا بار اٹھانے والوں کا ایمان کس درجہ کا ہونا چاہیے، اس کی کیفیت و ہیئت باری تعالیٰ نے آیت النور میں کھول کر ایک مثال کے ذریعے سمجھا دی ہے:

﴿اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ ؕ

اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ
مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ
نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۳۵)﴾

’’اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (بندۂ مومن کے دل میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو‘ چراغ ایک فانوس میں ہو‘ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی‘ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ چھوئے۔ (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔ اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے راہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔‘‘

یعنی بندۂ مؤمن کے دل میں حق اور قبولِ حق کی استعداد کی مثال مبارک زیتون کے تیل سے جلنے والے چراغ کی سی ہے جو محض آگ دکھانے سے بھڑک اٹھنے کے لیے بے تاب ہے۔ نورِ ایمان سے زجاجِ قلب چمکتا ہوا تارا بن جاتا ہے۔ رات کے گھپ اندھیرے میں تارا ہی ہدایت کا واحد ذریعہ بنتا ہے‘ اسی کو دیکھ کر مسافر رخ متعین کرتے ہیں۔ ایسے روشن قلب لوگ ہی منصب خلافت کے اہل بن سکتے ہیں۔ سورۃ النور کے اس مقام پر جہاں ایمانِ اعلیٰ کی مثال بیان کی گئی ہے‘ وہاں ایمان کے بالعکس کیفیت یعنی کفر کو بھی تمثیل سے ہی بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓی
اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئًا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ
الْحِسَابِ (۳۹) اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ
فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ
وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (۴۰)﴾

’’جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب‘ کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا‘ مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا بلکہ وہاں اس نے اللہ کو موجود پایا جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا‘ اور اللہ کو حساب لینے میں دیر نہیں

> لگتی۔ یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے' اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ سکے۔ اور جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں''۔

یعنی ان کے اعمال کی چکاچوند سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ کفر کے پاس انسان کی منزلِ مقصود تک راہنمائی کا مواد سرے سے موجود ہی نہیں ہے' مکمل اندھیرا ہے۔ اس قدر اندھیرا کہ انسان اپنا پھیلایا ہوا ہاتھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن کفر اور ایمان کے بین بین کی کیفیت جو زجاجِ قلب کو آلودہ اور بیمار کر دینے کا سبب بنتی ہے وہ ہے نفس انسانی کا فاحشہ کی طرف راغب ہونا۔ فاحشہ کی لت انسان کے لیے منافقت کے دروازے کھولتی ہے جس کا شکار ہو کر انسان بارِ خلافت اٹھانے سے نااہل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں انسان کے دل کو فاحشہ کی لت سے پاک صاف رکھنے کے لیے ایک طرف بدکار مرد اور بدکار عورت دونوں میں سے ہر ایک کو برسرعام (اگر غیر شادی شدہ ہیں تو) سو کوڑے مارنے کی عبرتناک سزا کا قانون دیا گیا ہے' تا کہ اس جرم کی خواہش دل کی جڑ بنیادوں سے کٹ جائے۔ نہ صرف دیکھنے والا ہمیشہ کے لیے اس کے قریب جانے سے تائب ہو جائے' بلکہ ہر سننے والا بھی کانوں کو ہاتھ لگائے۔ فاحشہ کی نشر و اشاعت کا کام کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ نفس اِنسانی اس میں اس قدر تلذذ لیتا ہے کہ حرمِ نبی مکرمﷺ کے بارے میں بھی زبان کو لگام نہیں دے پاتا۔ (اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا واقعہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؓ کی براءت کا اعلان بھی اسی سورۂ مبارکہ میں آیا ہے۔) فواحش کی طرف راغب ہونے سے وہی لوگ بچتے ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان کا چراغ بنایا ہے۔ ہما شما کی بات کیا ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف پردے کے احکام انتہائی باریک بینی سے بیان فرما دیے اور ان میں کوئی رخنہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ یہاں ان اخلاقی اور معاشرتی تدابیر کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا:

(۱) بدکار مردوں اور عورتوں سے معاشرتی مقاطعے کا حکم دیا گیا اور ان کے ساتھ رشتۂ مناکحت جوڑنے سے اہل ایمان کو منع کر دیا گیا۔

(۲) جو شخص دوسرے پر زنا کی تہمت لگائے اور پھر ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کر سکے اس کے لیے اسّی کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔

(۳) شوہر اگر بیوی پر تہمت لگائے تو اس کے لیے لعان کا قاعدہ مقرر کیا گیا۔

(۴) لوگوں کو عام ہدایت کی گئی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف نہ گھس جایا کریں بلکہ اجازت لے کر جائیں۔

(۵) عورتوں اور مردوں کو غض بصر کا حکم دیا گیا اور ایک دوسرے کو گھورنے یا تانک جھانک کرنے سے منع کر دیا گیا۔

(۶) عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں میں بھی سر اور سینہ ڈھانک کر رکھیں۔

(۷) عورتوں کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے محرم رشتہ داروں کے سوا کسی کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔

(۸) ان کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں تو نہ صرف یہ کہ اپنے بناؤ سنگھار کو چھپا کر نکلیں بلکہ بجنے والے زیور بھی پہن کر نہ نکلیں۔

(۹) معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کا طریقہ ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے نکاح کیے جائیں، حتیٰ کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی بن بیاہا نہ رہنے دیا جائے، اس لیے کہ تجرد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مجرد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

(۱۰) بدکاری بطور ذریعہ آمدن کے ممنوع قرار دے دیا گیا۔

(۱۱) گھریلو معاشرت میں خانگی ملازموں اور نابالغ بچوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ وہ خلوت کے اوقات میں یعنی صبح، دوپہر اور رات کے وقت گھر کے کسی مرد یا عورت کے کمرے میں اچانک نہ گھس جایا کریں۔ اولاد تک کو اجازت لے کر آنے کی عادت ڈالی جائے۔

(۱۲) بوڑھی عورتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ اگر وہ اپنے گھر میں سر سے اوڑھنی اتار کر رکھ دیں تو مضائقہ نہیں۔ مگر حکم دیا گیا کہ تبرج (بن ٹھن کر اپنے آپ کو دکھانے) سے بچیں۔ نیز انہیں نصیحت کی گئی کہ بڑھاپے میں بھی اگر وہ اوڑھنیاں اپنے اوپر ڈالے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

سورۃ الاحزاب میں دیے گئے احکام میں سے چند احکام عامۃ المسلمین کی راہنمائی کے لیے نہایت اہم ہیں:

(۱) ازواجِ مطہرات کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھیں۔ بناؤ سنگھار کر

کے باہر نہ نکلیں اور غیر مردوں سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہو تو دبی زبان سے بات نہ کریں' مبادا کوئی شخص بے جا توقعات قائم کر لے۔

(۲) حضورﷺ کے گھروں میں غیر مردوں کو بلا اجازت داخل ہونے سے روک دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ ازواجِ مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔

(۳) تمام مسلمان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ جب باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو چادروں سے اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانک کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلا کریں......'' (تفہیم القرآن)

اختلاطِ مرد و زن نظر کو بے باک کر دیتا ہے۔ نظر سے طلب پیدا ہوتی ہے۔ طلب جب ناجائز ملاپ تک پہنچتی ہے تو انسان اسفل سافلین کے مقام تک جا گرتا ہے۔ وہ منصبِ خلافت کا اہل نہیں رہ جاتا۔ سورۃ النور میں ان تین مضامین کا بیان یعنی پردے کے احکام کے ذریعے پاکیزہ معاشرے کا قیام' اعلیٰ ترین ایمان کی کیفیت و ہیئت اور منصبِ خلافت کی بشارت جس کے ذریعے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے' بلا حکمت تو نہیں آ گیا۔ معجزانہ ربط پر آپ خود بھی غور کیجیے۔ علامہ اقبال نے سچ ہی کہا ہے:ؔ

اگر پندے ز درویشے پذیری ہزار اُمت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری

''اگر تو ایک درویش کی نصیحت کو قبول کر لے تو ہزاروں اُمتیں فنا ہو سکتی ہیں لیکن تو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ حضرت فاطمہ زہرا بتولِ جنت ؓ کا شیوہ اختیار کر اور زمانہ کی نگاہوں سے چھپ جا تاکہ تیری آغوش میں شبیرؓ جیسا فرزند پرورش پا سکے۔''

معاشرہ کو پاک صاف رکھنے کے ان احکام پر عمل نہ کرنے سے معاشرے کی گود خیر سے خالی اور بانجھ ہو جاتی ہے اور وہ تباہی کے کنارے جا لگتا ہے۔ سورۃ الطلاق جس میں ازدواجی زندگی کے متعلق احکام نازل ہوئے ہیں' اس بربادی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

﴿وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ عَتَتۡ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبۡنٰهَا حِسَابًا شَدِيۡدًا ۙ وَّعَذَّبۡنٰهَا عَذَابًا نُّكۡرًا ⑧ فَذَاقَتۡ وَبَالَ اَمۡرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمۡرِهَا خُسۡرًا ⑨ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ ۛۚ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۛؕ قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكُمۡ ذِكۡرًا ۙ⑩ رَّسُوۡلًا يَّتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ﴾

> ’’کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے ربّ اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔ پس انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے‘ پس اللہ سے ڈرو اے صاحبِ عقل لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے۔ ایک ایسا رسول جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔‘‘

ابلیس لعین جس کے پیٹ میں خلافتِ انسانی کی وجہ سے مروڑ اٹھا تھا‘ انسان کی یہ کمزوری اس کی نظر میں ہے۔ اسلامی معاشرے کو تباہ کرنے کا سب سے مؤثر ہتھیار یہ فاحشہ کی لت ہے جس میں ملوث کرنے کے لیے وہ ہر حربہ اور طاقت کا استعمال کروا رہا ہے۔ منافقت پیدا کرنے کی دوسری وجوہات کے علاوہ بڑی وجہ یہی ہے جہاں سے منافقت حملہ آور ہوتی ہے۔ منافقت کی علامات جن کو معاشرے میں دیکھا جا سکتا ہے‘ وہ یہ ہیں:

(۱) فتنہ پروری (۲) عبادات سے جی چرانا (۳) اجتماعی ذمہ داریوں سے پہلوتہی۔

پردے کے احکام پر عمل کر کے انسانی دل کو آلودگی سے بچایا جا سکتا ہے تو جہاد فی سبیل اللہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر منافقت کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کے مسلمان نفس کی مستی میں گم ہو کر منزل کا شعور کھو بیٹھے ہیں اور یہود و نصاریٰ (شیطان کے چیلے) من چاہے طریقوں سے انہیں ذلیل کر رہے ہیں۔ اگر ہم کھوئے ہوئے اعزاز (منصبِ خلافت) کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو جہاں ہمیں حرام خوری سے بچنا ہو گا وہاں اسلام کے معاشرتی احکام پر سختی سے عمل پیرا ہونا ہو گا۔ تب ہی منافقت فداکاری میں بدل سکتی ہے اور ہمیں اعلیٰ اور صحیح قیادت میسر آ سکتی ہے۔

* * *

ذِمہ دارانّ کے مطلوبہ اوصاف

تنظیم اسلامی کے ذمہ داران کے ایک اجتماع سے خطاب

انجینئر نوید احمد

محترم ذمہ داران! آپ کو یہ تصور کر کے ایک سرور محسوس کرنا چاہیے اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دینی خدمت کے لیے ایک ذمہ داری آپ کو قدرت کی طرف سے تفویض ہوئی ہے۔ آپ خود اس کے خواہشمند نہیں تھے۔ اب آپ کے لیے بہترین موقع ہے صدقۂ جاریہ کے حصول کا۔ ماتحت رفقاء کی تربیت کر کے اور اُنہیں دین کے لیے متحرک کر کے آپ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ توشۂ آخرت جمع کر سکتے ہیں۔ البتہ ع ''جن کے رتبے ہیں سوا' اُن کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق اگر ہم نے ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کی اور کوئی ماتحت رفیق ہمارے طرزِ عمل کی وجہ سے بددل ہو گیا تو اِس کا وبال بھی ہمارے سر پر آئے گا۔ لہٰذا اپنے نازک مقام کا احساس کرتے ہوئے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ایک دینی تحریک کے ذمہ دار کے مطلوبہ اوصاف کیا ہیں' اور پھر اِن اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اِن اوصاف کو چار پہلوؤں سے آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی جائے گی:

(۱) ذاتی معاملات (۲) رفقاء سے تعلق (۳) نظم (۴) تحریک۔

(۱) ذاتی معاملات

(i) اللہ سے طلبِ نصرت:

تحریکی زندگی میں کسی منصب پر فائز ہونا بڑی بھاری ذمہ داری ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر اِس ذمہ داری کا ادا کرنا ناممکن ہے۔ پھر ہم کمزور ہیں اور بار بار ہم سے کوتاہیاں ہو جاتی ہیں' لہٰذا ہم محتاج ہیں کہ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کریں:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا

حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ﴾

’’اے ہمارے ربّ! ہم سے جو خطا یا بھول چوک ہوئی اِس پر ہماری پکڑ نہ فرمانا۔ اے ہمارے رب! ہمیں اُن آزمائشوں سے دوچار نہ کرنا جن سے تو نے ہم سے پہلے اہل ایمان کو دوچار کیا تھا۔ اے ہمارے ربّ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کو برداشت کرنے کی ہم میں سکت نہ ہو۔ ہمیں معاف فرما دے‘ ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی فرما‘ ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا حامی و ناصر ہے‘ پس کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما‘‘۔

اللہ سے طلبِ نصرت کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ شیطان اور اُس کا ایجنٹ نفس ہم پر ہر سمت سے حملہ آور ہیں۔ ویسے تو وہ ہر انسان کے دشمن ہیں لیکن دینِ حق کا علم اُٹھانے والوں کو وہ ایک آن بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ پھر جو لوگ تحریک کے سالار ہوتے ہیں وہ اِن کا اوّلین ہدف ہوتے ہیں کہ اگر اِن کو پچھاڑ دیا تو باقی پوری جماعت زیر ہو جائے گی۔ لہٰذا ہمیں خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ سے وہی دعا کرنی چاہیے جس کی تلقین اللہ نے دینِ حق کے عظیم ترین علمبردار‘ آقائے نامدار‘ حضرت محمدﷺ کو کی تھی :

﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ ﴾ (المؤمنون)

’’اور اے نبیﷺ! یوں دعا کیجیے: اے میرے ربّ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں شیطانوں کی چھیڑ سے‘ اور میں تیری پناہ میں آتا ہوں میرے رب کہ وہ میرے پاس آئیں‘‘۔

(ii) اخلاصِ نیت :

ذمہ داری کو اعزاز نہیں بلکہ امانت سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا خود نمائی کے بجائے آخرت کی جوابدہی کے احساس اور اللہ کی نصرت کے حصول کے لیے اُس کی رضا کو مقصود بناتے ہوئے ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو ذمہ داران تقریر‘ تصنیف‘ مؤثر افہام و تفہیم یا تنظیمی کام کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں‘ اُنہیں اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ کبھی بھی تکبر‘ احساسِ برتری یا خود نمائی کی خواہش پیدا نہ ہو۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ شیطان کا اوّلین ہدف دین کی خدمت کرنے والے اور بالخصوص اِس خدمت کو آگے لے کر چلنے والے ہیں۔ اُن کی نیتوں کا خلوص شیطان کے لیے حد درجہ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ وہ نیتوں میں کھوٹ پیدا

کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ان کے سارے کے سارے اعمال ہی اکارت چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ شَکُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ صَبُوْرًاوَّاجْعَلْنِیْ فِی عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّ فِی اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا (۱)

''اے اللہ! مجھے شکر کرنے والا اور صبر کرنے والا بنا دے' اور مجھے میری اپنی نگاہوں میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا دے۔''

(iii) ذاتی کردار میں عزیمت:

ذمہ داران کو اپنے ماتحت رفقاء کے لیے ایک نمونہ بننا چاہیے۔ اُنہیں رخصتوں سے بچ کر عزیمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کا مزاج دراصل دینی مزاج کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔ دینی مزاج کی خامی ایک عام رفیق تنظیم کے حق میں بھی کچھ کم افسوس ناک چیز نہیں' لیکن ذمہ داران کے حق میں تو اسے قابلِ ملامت ہی کہا جائے گا' کیونکہ اِس خامی کے اثرات صرف اُنہی کی ذات تک محدود نہ رہیں گے' بلکہ اِس کا کچھ نہ کچھ اثر اُن کے مأمورین پر بھی پڑ کر رہے گا اور یہ تحریک کی پیش رفت میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔

رخصتوں سے بچنے کے علاوہ عزیمت کی راہ سے مراد یہ بھی ہے کہ حرام سے اجتناب اور فرائض کی ادائیگی تو لازمی امور ہیں' ذمہ داران کو اِس سے آگے بڑھ کر سنت اور مستحبات کو بھی اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ معاش میں مشتبہات اور معاشرت میں ہر طرح کی بے حجابی ولغویات سے اجتناب ضروری ہے۔ نوافل بالخصوص تہجد کا اہتمام ذمہ داران کے لیے لازم ہے تاکہ اُس وقتِ خاص میں اللہ سے اپنے لیے' اپنے ساتھیوں کے لیے اور پوری امت کے لیے بخشش' عافیت' بھلائیوں اور مختلف امور میں نصرتِ الٰہی کی دعا کر سکیں۔ وضع قطع اور لباس میں سنت سے زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کریں تاکہ محسوس ہو کہ ہم پوری یکسوئی کے ساتھ دین سے وابستہ ہیں۔ یہ مغرب کی غلامی کے اثرات ہیں کہ ہم آج بھی مغربی لباس پہننا پسند کرتے ہیں حالانکہ ہمارا لباس زیادہ ساتر ہے۔ مغربی لباس میں سجدے اور رکوع کے دوران تو جسم کے خدوخال اِس طرح نمایاں ہوتے ہیں کہ نظر پڑتے ہی شرم آتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اپنے اسلاف کا علم' تحقیق' جستجو' محنت اور امانت و دیانت جیسا عظیم ورثہ مغرب کو دے دیا اور مغرب سے شرم و حیا' عصمت و عفت اور ادب و احترام سے عاری مادّہ پرستانہ

ولحدانہ اقدار قبول کرلیں۔ بقول اقبال : ؎

مگر وہ علم کے موتی ' کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں' تو دل ہوتا ہے سی پارا

اور بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم : ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے!

اِسی طرح فیشنی داڑھی سے بھی دینی رنگ ظاہر نہیں ہوتا' ہمیں مسنون داڑھی رکھنی چاہیے۔ بانئ تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تو رفقاء کے لیے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ اُن کا تحریکی فکر جماعتِ اسلامی والا ہو لیکن وضع قطع تبلیغی جماعت والوں جیسی ہو۔

(iv) قول و فعل میں مطابقت :

ذمہ داران کے قول و فعل میں تضاد کے منفی اثرات بہت دور تک جاتے ہیں اور ساتھیوں کے دین سے متنفر ہونے کا باعث بن سکتے ہیں۔ خاص طور پر تنہائی میں بھی اپنے عمل کے حوالے سے احتیاط کرنی ہے کیونکہ تنہائی کا تقویٰ' محفل میں انسان کی بات میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ قول و فعل کا تضاد نہ صرف ہمیں اللہ کی نصرت سے محروم کرے گا بلکہ ہم اُس کے غضب کے شکار ہو جائیں گے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ② كَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ③﴾ (الصف)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک بڑی ہے یہ بات بیزار کرنے کے اعتبار سے کہ تم ایسی بات کہو جو کرتے نہیں''۔

(v) قناعت :

ہمیں اللہ کی رضا کی خاطر اپنے معیارِ زندگی کو کم سے کم تر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور وسائل کو کسی کارِ خیر میں لگا کر توشۂ آخرت بنانا چاہیے۔ ہمارے ماتحت رفقاء میں معاشی اعتبار سے مفلس ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ معیار کا لباس' گھڑی' موبائل' گاڑی' وغیرہ دیکھ کر

مرعوب اور احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ ذمہ داران کی قناعت سے اُن رفقاء کے ساتھ فاصلے کم ہوں گے اور ایک عمدہ ٹیم ورک کے ساتھ کام آگے بڑھے گا۔ ارشاداتِ نبوی ﷺ ہیں:

((مَنْ تَرَکَ لُبْسَ ثَوْبِ جَمَالٍ وَھُوَ یَقْدِرُ عَلَیْہِ تَوَاضُعًا کَسَاہُ اللّٰہُ حُلَّۃَ الْکَرَامَۃِ)) (۲)

”جو شخص زینت کے لباس کو ترک کر دے اِس حال میں کہ وہ اِس کے پہننے کی استطاعت وقوت رکھتا ہو مگر صرف کسرِ نفسی کے لیے تو اللہ تعالیٰ اُسے عظمت و بزرگی کا لباس پہنائے گا“۔

((اَلَا تَسْمَعُوْنَ اَلَا تَسْمَعُوْنَ! اِنَّ الْبَذَاذَۃَ مِنَ الْاِیْمَانِ ، اِنَّ الْبَذَاذَۃَ مِنَ الْاِیْمَانِ)) (۳)

”جان لو، جان لو! بے شک لباس میں سادگی اختیار کرنا ایمان کی علامت ہے۔ بے شک لباس میں سادگی اختیار کرنا ایمان کی علامت ہے“۔

(۲) رفقاء سے تعلق

(i) احساسِ مسئولیت:

ساتھیوں کے حوالے سے ہر وقت اُخروی جوابدہی کا احساس ہم پر طاری رہنا چاہیے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((اَلَا فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) (۴)

”آگاہ ہو جاؤ کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور اُس سے اُس کے ماتحت لوگوں کے بارے میں سوال ہوگا“۔

جس مقصد کے لیے ساتھی ہماری نگرانی میں دیے گئے ہیں، ہماری پوری کوشش ہو کہ اُنہیں اُسی مقصد کے کام کے آدمی بنائیں۔ تحریکی نصب العین کا شعور، اِس کے لیے بھرپور جدوجہد کا عزم اور اِس اعتبار سے مطلوبہ اوصاف اُن میں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(ii) ساتھیوں کو اللہ کی نعمت سمجھنا :

ماتحت ساتھیوں کو اللہ کا عطیہ اور انعام سمجھنا چاہیے۔ اُن کے ذریعہ سے اللہ نے مدد فرمائی، خدمتِ دین کا کام ممکن ہو سکا اور صدقۂ جاریہ کی سبیل پیدا ہوئی۔ اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

کو نبی اکرم ﷺ کے لیے اللہ کی مدد کی فراہمی کا ذریعہ قرار دیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الانفال: ٦٢)

''وہ اللہ ہے جس نے آپ کی مدد فرمائی اپنی نصرت سے اور اہلِ ایمان ساتھیوں کے ذریعے''۔

جب ساتھیوں کو اللہ کی نعمت سمجھا جائے گا تو اِس سے اُن کے ساتھ ہمارا رویہ انتہائی خوشگوار اور اُنہیں اپنی طرف کھینچنے والا ہوگا۔

(iii) ساتھیوں کو اہم ترین سمجھنا:

ہمارے نزدیک اہم ترین رشتہ وہ ہونا چاہیے جو دین کی بنیاد پر قائم ہوا۔ اللہ نے قرآنِ مجید میں اپنے محبوب بندوں کی صفات کے ذیل میں اِس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ٢٩)

''وہ کافروں کے حق میں بڑے سخت ہیں اور آپس میں نہایت مہربان ہیں''۔

﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (المائدہ: ٥٤)

''مومنوں کے حق میں بہت ہی نرم ہیں اور کافروں کے لیے انتہائی سخت ہیں''۔

ایک حدیثِ قدسی ہے:

وَجَبَتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ (٥)

''میری محبت واجب ہوگئی اُن لوگوں کے لیے جو میری وجہ سے محبت کریں، اور میری وجہ سے کہیں مل کر بیٹھیں، میری وجہ سے باہم ملاقات کریں، اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کریں''۔

ذمہ داران کی رفقاء سے محبت، اُنہیں ساتھیوں کے لیے ظاہری طور پر ہی نہیں دلی اور ذہنی طور پر بھی اُن کا مامور بنا دے گی۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَ يُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ)) (٦)

''تمہارے اچھے پیشوا وہ ہیں جن کو تم محبوب رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں، جن کے لیے تم دعائے رحمت کرتے ہو اور وہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہوں''۔

(iv) شفقت اور نرمی:

اقامتِ دین کی جدوجہد میں شریک ہر ساتھی رضا کارانہ طور پر کام کرتا ہے۔ اُس کے سامنے کوئی دنیا کا مفاد نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کا حصول اور آخرت کی کامیابی ہوتی ہے۔ ایسے ساتھیوں سے مفید اور مؤثر کام اُسی وقت لیا جا سکتا ہے جبکہ اُن کے ساتھ رویہ تحکمانہ نہیں بلکہ مشفقانہ ہو۔ ہماری گفتگو اور طرزِ عمل میں نرمی اور شفقت اِس طرح سے ہو کہ ہر مامور محسوس کرے کہ اِن کے دل میں میری بڑی قدر و اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے حوالے سے جس طرزِ عمل کا حکم دیا ہے ویسا ہی حکم ذمہ داران کو رفقاء کے حوالے سے دیا گیا ہے:

﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (٨٨)﴾ (الحجر)

’’(اے نبیﷺ!) اپنے شانے جھکایئے (شفقت سے) اہلِ ایمان کے لیے‘‘۔

﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (٢١٥)﴾ (الشعراء)

’’(اے نبیﷺ!) اپنے شانے جھکایئے (شفقت سے) اُن اہلِ ایمان کے لیے جو آپ کی پیروی کریں۔‘‘

سورۃ الشعراء کی متذکرہ آیت سے ظاہر ہے کہ نرمی اور شفقت کا معاملہ اُن ساتھیوں کے ساتھ اور زیادہ ہونا چاہیے جو نظم کے پابند اور فعال ہیں۔ ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

اگر کبھی خود مفادِ تحریک کا تقاضا ہو کہ کسی ساتھی پر گرفت کی جائے تو اِس گرفت میں بھی حتی الوسع سخت گیری سے بچنا چاہیے۔ اجتماعیت اپنی صحت اور اپنے اندرونی اِستحکام کے لیے بڑی حد تک ذمہ داران کی اِسی نرم روی پر انحصار کرتی ہے۔ ذمہ دار کا مزاج اگر سخت ہو گا تو ساتھی بددل ہوں گے اور اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا:

﴿فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَہُمۡ ۚ وَلَوۡ کُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِکَ ۪﴾ (آلِ عمران: ١٥٩)

’’یہ اللہ کی رحمت ہے (اے نبیﷺ!) کہ آپ اُن کے حق میں نہایت نرم ہیں، اگر آپ ہوتے تندخو اور سخت دل تو یہ آپ کے پاس سے چلے جاتے‘‘۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

نوٹ فرمایئے! جب تند خوئی اور سخت دلی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ جیسی عظیم اور بے مثال ہستی کے لیے بھی اپنے ساتھیوں کی جمعیت کو برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا تو دوسرے کس شمار و قطار میں ہیں؟ معلوم ہوا کہ نرم مزاجی جہاں انسان کی سیرت کا ایک دلکش حسن ہے‘ وہاں اپنوں کو مضبوطی سے جوڑے رکھنے کا ایک ناگزیر ذریعہ بھی ہے۔ اس کے بغیر تحریک کا اجتماعی نظم پائیدار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نرم خوئی کس پائے کی ایمانی صفت ہے‘ اِسے جاننے اور سمجھنے کے لیے قرآنِ کریم کا یہ بیان ہی کافی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نرم مزاجی تو فی الواقع اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خاص عطیہ تھی۔ لہٰذا شفقت اور نرمی کسی تدبیر یا پالیسی کے تحت نہیں بلکہ اِسے مزاج کا حصہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کے دو ارشادات لرزا دینے والے ہیں :

((مَن يُّحرَمُ الرِّفقَ يُحرَمُ الْخَيرَ كُلَّهٗ)) (۷)

’’جو شخص نرم مزاجی سے محروم ہو گیا وہ گویا ہر طرح کی بھلائی سے محروم ہو گیا‘‘۔

((اَللّٰهُمَّ مَن وَّلِىَ مِنْ اَمرِ اُمَّتِىْ شَيْئًافَشَقَّ عَلَيهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيهِ)) (۸)

’’اے اللہ! جو کوئی میری امت کے کسی معاملہ کا ذمہ دار ہوا اور وہ لوگوں پر سختی کرے تو تُو اُس پر سختی کر‘‘۔

سختی اور سخت گیری کا یہ ہولناک انجام سامنے ہو تو نرمی اور نرم خوئی کی قدر و قیمت آپ سے آپ ہمیں معلوم ہو جائے گی۔

(۷) عفو و درگزر اور رفقاء کے لیے دعا :

رفقاء کی کوتاہیوں سے نہ صرف درگزر کیا جائے بلکہ شعوری طور پر دل سے اُن کے بارے میں ہر کدورت کو صاف کیا جائے۔ غزوۂ اُحد میں چند ساتھیوں سے بہت بڑی غلطی ہوئی‘ جس کے نتیجے میں فتح شکست میں بدل گئی اور ۷۰ ساتھی شہید ہو گئے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا :

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ (آلِ عمران : ۱۵۹)

’’پس (اے نبی ﷺ!) اِن سے درگزر کیجیے اور اِن کے حق میں دُعائے مغفرت کیجیے‘‘۔

ساتھیوں کے حق میں دعا اِس بات کا مظہر ہے کہ عفو و درگزر رسمی و قانونی نہیں بلکہ واقعی اور صدقِ

دل سے ہے۔ البتہ بعض اوقات خود تحریک ہی کا مفاد تقاضا کرتا ہے کہ اس موقع پر سرزنش سے کام لیا جائے‘ لیکن یہ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں۔ عام روش عفوودرگزر ہی کی رہنی چاہیے۔ اِس کے بغیر جماعتی نظم میں باہمی حسنِ تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔

(vi) مشاورت:

رفقاء کو معاملات میں شرکت کا احساس (sense of participation) دلانے اور اُن پر اظہارِ اعتماد کو ظاہر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر اہم کام میں رفقاء سے مشورہ کیا جائے تاکہ کوئی بھی کام ایک ٹیم ورک کے طور پر کیا جاسکے۔

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾﴾ (آلِ عمران)

’’اور (اے نبیﷺ !) معاملات میں اِن کو شریکِ مشورہ رکھیے۔ پھر جب آپ کسی بات کا عزم کرلیں تو چاہیے کہ اللہ پر بھروسہ کریں‘ یقیناً اللہ اُنہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اُس پر بھروسہ کرنے والے ہیں‘‘۔

(vii) حوصلہ افزائی:

رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کی کارکردگی کئی درجہ بڑھ جاتی ہے اگر اُن کی حوصلہ افزائی اور تحسین کی جاتی رہے :

﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥٤﴾﴾ (الانعام)

’’اور (اے نبیﷺ !) جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو (آپ شفقت و محبت سے اُن کا خیر مقدم کرتے ہوئے) فرمایئے تم پر سلامتی ہو‘ تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت لازم کررکھی ہے۔ اگر تم میں سے کوئی نادانی میں کوئی برائی کر بیٹھے اور پھر توبہ کرے اور اپنی (حالت کی) اصلاح کرلے تو (اللہ اُسے معاف کردے گا کیوں کہ) وہ غفورٌ رَّحیم ہے‘‘۔

(viii) اصلاح کرنا :

رفقاء کی تربیت‘ اُن کے اشکالات کو دور کرنا‘ اُن کے معاملات کی نگرانی کرنا اور اُن کی

کوتاہیوں پر متوجہ کرنا ذمہ دار کے فرائض میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ نظم کے تقاضے ادا نہ کرنے یا کسی اور کوتاہی پر حکمت کے ساتھ اور علیحدگی میں اصلاح کی کوشش کی جائے۔

فَاِنۡ عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ﴿۲۱۷﴾ (الشعراء)

’’پھر اگر (اے نبیﷺ) وہ آپ کی نافرمانی کریں تو (اُن سے صاف) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے اَفعال سے بریٔ الذمہ ہوں۔ اور (اے نبیﷺ) آپ بھروسہ کیجئے اُس ہستی پر جو زبردست اور رحیم ہے‘‘۔

اصلاحی وعظ و نصیحت اگر مخلصانہ اور دردمندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کا انداز بھی لیے ہوئے ہو تو اِس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ نبی اکرمﷺ مربیٔ اعظم تھے۔ اُن کا تربیت کا انداز کتنا حکیمانہ تھا‘ اِس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے :

(i) رسول اللہﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق‘ جبکہ آپؓ ابھی نوعمر تھے‘ اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا:

((نِعۡمَ الرَّجُلُ عَبۡدُاللّٰہِ لَوۡ کَانَ یُصَلِّیۡ مِنَ اللَّیۡلِ))(۹)

’’عبداللہ کیا خوب آدمی ہیں‘ کیا اچھا ہوتا اگر وہ رات میں نماز بھی پڑھا کرتے‘‘۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب رسول اللہﷺ کا یہ ارشاد معلوم ہوا تو اُنہوں نے فوراً فیصلہ کر لیا اور پھر وہ راتوں میں کم سونے لگے۔

(ii) ایک بار آپﷺ نے حضرت خریم الاسدیؓ کے بارے میں فرمایا :

((نِعۡمَ الرَّجُلُ خُرَیۡمٌ الۡاَسَدِیُّ لَوۡ لَا طُوۡلُ جُمَّتِہٖ وَاِسۡبَالُ اِزَارِہٖ))(۱۰)

’’خریم بڑے اچھے آدمی ہیں‘ کاش اُن کے بالوں کی لٹ اتنی لمبی اور اُن کی تہبند نیچے تک لٹکتی نہ ہوتی!‘‘

نتیجہ اس طرزِ تربیت کا حسب توقع یہ نکلا کہ آپﷺ کے یہ الفاظ حضرت خریمؓ تک پہنچے تو دل میں تیر بن کر اُتر گئے‘ اُنہوں نے ایک چھری اٹھائی اور اپنی لٹوں کو کاٹ کر رکھ دیا اور اپنی تہبند کو ٹخنوں سے اُوپر اٹھا لیا۔

(iii) اگر کوئی غلطی آپﷺ کی نگاہ میں زیادہ قابلِ توجہ اور قابلِ گرفت قرار پاتی تو اِس کی اصلاح کے اندر حکمت کے ساتھ قدرے سختی کا عنصر بھی شامل فرماتے۔ آپﷺ ایسے مواقع پر یوں فرماتے: ’’مَا بَالُ اَقۡوَامٍ‘‘ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے یا ایسا ایسا کہتے ہیں!

گویا ایسے مواقع پر بھی آپ ﷺ غلطی کرنے والوں کے نام لیے بغیر نصیحت اور تنبیہہ بالکل عمومی انداز میں فرمایا کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ کلام آپ ﷺ اِس مصلحت کی خاطر اختیار فرماتے کہ لوگوں میں کہیں ناگواری کا جذبہ نہ ابھر آئے اور اس طرح نصیحت وتنبیہہ کا مقصد ہی فوت ہو کر نہ رہ جائے۔

اصلاح وتربیت کے بارے میں ہمیں بھی اِسی اُسوے کی پیروی کرنی چاہیے' کیونکہ اِس اندازِ تربیت سے بہتر انداز دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

(ix) مسائل کے حل کی کوشش :

اپنے ساتھیوں کی دلی خیر خواہی ذمہ داران کا اہم وصف ہے۔ ایک ذمہ دار کا اپنے ہر ساتھی کے ساتھ ایک قریبی ذاتی تعلق ہونا چاہیے تاکہ وہ اُن کے نجی حالات سے پوری طرح باخبر ہو۔ اُس کے علم میں ہو کہ اُس کے رفقاء کو کیا مسائل درپیش ہیں؟ پھر اُن کے مسائل کے حوالے سے وہ اُن کے دکھ درد کا ساتھی ہو اور اُنہیں مشکلات سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾﴾ (التوبۃ)

''(مسلمانو) تمہارے پاس تم ہی میں سے (اللہ کے) رسول آ گئے ہیں۔ تمہاری تکلیف اُن پر شاق گزرتی ہے' تمہارے لیے ہر بھلائی کے خواہش مند ہیں اور اہلِ ایمان کے حق میں بالخصوص انتہائی شفیق (اور) رحیم ہیں۔''

ارشاداتِ نبوی ﷺ ہیں:

((مَا مِنْ اَمِيْرٍ يَلِيْ اَمْرَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَ يَنْصَحُ اِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ)) (۱۱)

''ہر وہ امیر جو مسلمانوں کے معاملات کا نگران و ذمہ دار ہو' مگر وہ اُن کے بھلے کے لیے جدوجہد نہ کرے' نہ اُن کی خیر خواہی کرے تو وہ اُن کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا''۔

((مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ شَيْئًا مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ عَنْهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَخَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ)) (۱۲)

> ''جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی معاملے کا والی وانتظام کار بنایا ہو وہ اگر اُن کی ضرورتوں‘ حاجت مندیوں اور ناداریوں کے مسائل اپنے تک نہ پہنچنے دے تو قیامت کے دن اللہ اُس کی ضرورتوں‘ حاجت مندیوں اور ناداریوں کی طرف سے پردہ کرے گا''۔

اپنے مأمورین کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے کی یہ اہمیت تو اُخروی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ تحریکی اور تنظیمی نقطۂ نگاہ سے اِس کی اہمیت یہ ہے کہ مأمورین کی نفسیات پر اِس کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اپنے ذمہ داروں کے ساتھ اُن کی محبت اور الفت میں اضافہ ہوتا ہے‘ دوسری طرف تحریک کے فروغ کے لیے اُن کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ متحرک سے متحرک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں نتائج اُلٹے نکلتے ہیں۔ ذمہ داروں اور مأمورین کے درمیان وہ قربت باقی نہیں رہتی جو رہنی چاہیے‘ جس سے تحریک کی پیش رفت متأثر ہوتی ہے۔

(x) صبر و تحمل :

جماعتی زندگی میں ذمہ داران پر ذاتی تنقید کی صورت سامنے آتی رہتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی کئی بار اِس تکلیف دہ صورت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر اجتماعیت میں ایسے خام کار لوگ موجود ہوا ہی کرتے ہیں جو حدود کا لحاظ نہیں رکھ پاتے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے ناروا تنقید یا کوئی اور اشتعال انگیز حرکت ہو جائے تو اِس پر غصہ کا آنا فطری ہے اور یہ شرعاً بھی کوئی مذموم چیز نہیں ہے۔ مذموم بات صرف یہ ہے کہ غصہ کے عالم میں صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا جائے۔ ایسے موقع پر صبر و تحمل نہ صرف اپنی ذات بلکہ پوری تحریک کے لیے بظاہر کڑوا لیکن درحقیقت ایک میٹھا اور مقوی پھل ثابت ہوتا ہے۔

(xi) عاجزی وانکساری:

عاجزی وانکساری اگرچہ بجائے خود ایک اعلیٰ انسانی جوہر اور ایمانی صفت ہے‘ لیکن تحریکی نظم کو مستحکم کرنے کے لیے اِس کی افادیت دو چند ہے۔ ذمہ دار کا متواضعانہ رویّہ ساتھیوں کو اُس کا گرویدہ بنا دیتا ہے۔ اب ساتھی پورے جوش‘ ولولہ اور دلی لگن کے ساتھ ذمہ دار کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ البتہ ذمہ داران کے لیے عاجزی وانکساری کی روش اختیار کیے رہنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ تحریک میں نمایاں پوزیشن ایک فتنہ بن جانے کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ اِس فتنہ سے بچنے کا ذریعہ اِس حقیقت کا گہرا شعور ہے کہ

کسی اسلامی تحریک میں مناصب کی حیثیت اصلاً نہ تو کسی استحقاق کی ہوتی ہے نہ کسی اعزاز و افتخار کی، بلکہ ایک ہمت آزما بھاری ذمہ داری کی ہوتی ہے۔ اِس ذمہ داری کے احساس سے جب ایک ذمہ دار عاجزی وفروتنی اختیار کرتا ہے تو یہ بظاہر ایک پستی ہوتی ہے، مگر فی الواقع عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نبی اکرمﷺ نے بشارت دی ہے کہ :

((مَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰہِ اِلاَّ رَفَعَہُ اللّٰہُ))(۱۳)

''جو شخص اللہ کے لیے متواضعانہ روش اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند کر کے رہتا ہے''۔

فروتنی اور تواضع کا یہ ثمرہ آدمی کی اپنی ذات کو تو ملتا ہی ہے، تحریک کو اِس کا فائدہ اس سے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ ایسے ذمہ داران اپنے مأمورین کی نگاہوں کا تارا بن جاتے ہیں۔ اُن کی امارت اُن لوگوں کے ظاہر ہی کی طرح ان کے دلوں اور دماغوں پر بھی قائم ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی ذمہ داران وہ اصحابِ امر ہوتے ہیں جو اپنے مأمورین کے اندر نظم کی پابندی اور دعوتی جدوجہد کا ولولہ پیدا کر سکتے ہیں اور اِسے بیدار رکھ سکتے ہیں۔

(xii) ساتھیوں کو متحرک رکھنے کے لیے تذکیر:

رفقاء کو متحرک رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُنہیں دینی ذمہ داریوں کی مسلسل یاددہانی کرائی جاتی رہے اور خاص طور پر اُن میں آخرت کی باز پرس کا احساس پیدا کیا جائے۔ آخرت کے حوالے سے انذار اور تبشیر دونوں پہلو سامنے رکھے جائیں۔ نبی اکرمﷺ کا یہی اسلوبِ تذکیر تھا :

﴿اِنَّـآ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾(البقرۃ:۱۱۹)

''بے شک (اے نبیﷺ!) ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا بنا کر اور خبردار کرنے والا بنا کر''۔

(۳) نظم

نظم کے حوالے سے ذمہ داران کو ہر معاملہ میں سبقت کرنی چاہیے، یہی سنتِ نبویﷺ ہے:

﴿قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾﴾(الانعام)

''(اے نبیﷺ اُن سے!) کہیے کہ بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا

اور میرا مرنا اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں
‘اور مجھے اِسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اُس کا فرمانبردار ہوں‘‘۔

کسی پروگرام میں بروقت حاضری‘ ماہانہ انفاق اور رپورٹس کی تیاری میں ہم خود اگر سب سے آگے ہوں گے تو رفقاء کو بھی ترغیب دے سکیں گے۔

(۴) تحریک

تحریک کے حوالے سے یہ آیت ہمیشہ ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ :

﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ (الحج : ۷۸)

’’اور اللہ کی راہ میں ایسے جہاد کرو جیسا کہ اُس کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ہے۔‘‘

تحریکی کاموں میں ہم جتنے سرگرم ہوں گے ساتھی بھی اُسی نسبت سے فعال ہوں گے۔ دعوتی پروگراموں‘ ہینڈبلز کی تقسیم‘ کارنر میٹنگز اور مظاہروں میں ہم جتنے متحرک ہوں گے اتنے ہی ہمارے ساتھی بھی ذوق وشوق سے اِن میں حصہ لیں گے۔

حواشی

(١) ضعیف الجامع للالبانی‘ ح ١١٦٧۔
(٢) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب من کظم غیظاً۔
(٣) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الترجل۔
(٤) صحیح البخاری‘ کتاب العتق‘ باب کراھیۃ التطاول علی الرقیق وقولہ عبدی او امتی۔
(٥) موطا امام مالک‘ کتاب الجامع‘ باب ما جاء فی المتحابّین فی اللّٰہ۔
(٦) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب خیار الائمۃ وشرارھم۔
(٧) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی الرفق۔
(٨) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر......
(٩) صحیح البخاری‘ کتاب الجمعۃ‘ باب فضل قیام اللیل۔ وصحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابۃ‘ باب فقۃ فضائل عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما۔
(١٠) سنن ابی داوٗد‘ کتاب اللباس‘ باب ما جاء فی اسبال الازار۔
(١١) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب استحقاق الوالی الغاش لرعیتہ النار۔
(١٢) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الخراج والامارۃ والفیٔ‘ باب فیما یلزم الامام من امر الرعیۃ والحجبۃ عنہ۔
(١٣) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب استحباب العفو والتواضع۔

اسلامی تحریکیں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟

اسباب اور تجاویز

قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار

اسلامی تحریکیں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟ یہ حساس نوعیت کا ایک اہم مسئلہ ہے جس کا کما حقہٗ جواب دینا میرے لیے انتہائی مشکل ہے‘ لیکن اپنی بشری استطاعت کے مطابق میں پوری محنت اور خلوص کے ساتھ اس موضوع کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں کمی بیشی کا امکان باقی رہے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اہل فکر ونظر میرے اس بنیادی سوال سے ہی اتفاق نہ کریں۔ میں اپنی اس طالب علمانہ کاوش پر اہل دانش کی تعلیقات کا منتظر رہوں گا۔ اس مقالہ کے ذریعہ سے قطعاً کسی پر تنقید مقصود نہیں بلکہ بعض اہم پہلوؤں کی پورے خلوص اور دردِ دل کے ساتھ نشاندہی مطلوب ہے۔ ذیل میں نکات کی شکل میں اپنی معروضات نذرِ قارئین کرتا ہوں۔

① اسلامی تحریکیں چونکہ بہت اعلیٰ مقاصد کے تحت قائم ہوتی ہیں اس لیے ان کو ناکام کرنے کے لیے شیطانی قوتیں بھی اسی قدر کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں اُترتی ہیں‘ اور عموماً اسلامی تحریکوں کی ناکامی اور زوال کا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب رفقاء اور ذمہ داران کے مابین کچھ بے جا پیچیدگیاں اور بعض چھوٹی چھوٹی بدگمانیاں پیدا ہونا شروع ہو جائیں۔ اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا جائے تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ایک وقت پر جا کر کسی آتش فشاں کی شکل اختیار کر جاتی ہیں جس کے پھٹنے سے اس تحریک کا بنیادی ڈھانچہ ہی پارہ پارہ ہو جاتا ہے‘ لہٰذا ان وقتی بے چینیوں کا جلد تدارک کرنا انتہائی ضروری ہے۔

جہاں تحاریک اسلامیہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ رفقاء کے مسائل کا قابل اطمینان حل تلاش کریں وہاں رفقاء کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی قیادت سے بدگمان نہ ہوں‘ بلکہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی لغزشوں کی انتہائی اچھے طریقے سے نشاندہی کریں اور انہیں ایک عام انسان سمجھتے ہوئے ان کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں سے درگزر کا رویہ اپنائیں‘ تاکہ جس عظیم مقصد کے لیے انہوں نے باہم مل کر جدوجہد کرنے کا عزم کیا ہے اس کو حاصل کر سکیں اور بعض

شخصی انا پرستیاں ان کے راستے کی دیوار نہ بن سکیں۔ اس کے ساتھ انہیں اپنا عظیم مقصد بھی دہراتے رہنا چاہیے تاکہ بعض ہلکی نوعیت کی غلطیاں ان کے مقصد عظیم کو تباہ نہ کر دیں۔

② اسلامی تحریک کی کامیابی کے لیے جہاں بہت سی دوسری چیزوں کی ضرورت ہے وہاں یہ بات بھی انتہائی اہم ہے کہ کارکنانِ حرکاتِ اسلامیہ اعلیٰ کردار اور اخلاقیات کے مالک ہوں‘ کیونکہ کوئی بھی قوم تنزلی اور بربادی کا شکار اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اخلاقی زبوں حالی کا شکار ہو جائے‘ اور رفقاء کو صرف اسی پر ہی خوش نہیں ہونا چاہیے کہ ان کی تحریک کا مقصد اعلیٰ ہے بلکہ بنیادی اسلامی اقدار کا حامل ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

③ بڑے بڑے اجتماعی نصب العین لے کر اٹھنے والی تحریکوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذمہ داران اور کارکنان کے ظرف بھی بہت کھلے ہوں‘ اور خصوصاً اسلامی تحریکوں کے لیے تو یہ بات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے کہ ان کا آپس کا ماحول انتہائی ہمدردانہ اور محبت و ایثار کے پاکیزہ جذبوں سے بھرپور ہو‘ ہر ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کی قدر کرنے والا ہو اور تمام رفقاء کی شخصی تکریم وتحریم دل میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا عقیدت مندانہ اظہار بھی ہو۔ ہر ایک رفیق جذبۂ خدمت سے سرشار ہو اور آپس کے تعلقات اس قدر اعلیٰ بنیادوں پر استوار ہوں کہ کسی ایک ساتھی کو تکلیف میں دیکھ کر پوری تحریک تکلیف محسوس کرے۔ اور پھر دل اس قدر کھلے ہوں کہ اگر کوئی ساتھی اصلاح کے پیش نظر کسی بات پر تنقید کرے تو اسے خوش دلی سے قبول کیا جائے اور اس پر شکریہ ادا کیا جائے‘ نہ کہ جذبۂ انتقام بھڑک اٹھے اور جب تک اس سے بدلہ نہ لے لیا جائے چین نہ آئے۔ یہاں ایک امر انتہائی قابل توجہ ہے کہ بعض رفقاء کو اللہ ربّ العزت نے بہترین اندازِ تکلم سے نہیں نوازا ہوتا‘ جس کی وجہ سے وہ صحیح طور پر اپنا مدعا نہیں بیان کر سکتے اور الفاظ کے چناؤ میں بعض دفعہ بے ادبی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے افراد کو جھڑکنے اور ان کا مذاق اڑانے کے بجائے ان کے درد کی قدر کرتے ہوئے ان کا مدعا سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان کی اس کمی کو دور کرنے کے لیے ان کی مناسب رہنمائی کرنی چاہیے۔

سوالات‘ اعتراضات اور جائز تنقیدات کسی بھی تحریک کے کارکنوں کی فکری بیداری اور شعوری صحت مندی کی دلیل اور اسے اعلیٰ منازل تک پہنچانے کی کلید ہوتے ہیں‘ لہٰذا ان کا دائرہ کسی صورت بھی بند نہ ہو‘ بلکہ اعتراضات اور تنقیدات کا جائز اور مدلل حل پیش کیا جائے تاکہ رفقاء فکری ونظری ترقی کر سکیں‘ ورنہ ایک جامد تحریک ہمیشہ جامد ہی رہتی ہے‘ اس کے پھلنے پھولنے کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔

④ انسان کی طبیعت میں ذمہ داری کا احساس نہ ہو تو وہ کسی تحریکی زندگی میں تو کیا گھر کی انفرادی زندگی میں بھی ایک غیر مؤثر فرد قرار پاتا ہے‘ اس کا شخصی وقار اور اس کے وعدوں پر اعتبار ختم ہو جاتا ہے‘ اس لیے کسی بھی کارکن میں احساس ذمہ داری کا موجود ہونا انتہائی اہم ہے۔ تحاریکِ اسلامیہ میں عموماً رفقاء نظم کے خوگر ہوتے ہیں‘ لیکن بعض دفعہ کوئی کارکن دانستہ یا نادانستہ طور پر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے جس کی وجہ سے نظم جماعت میں خاصا خلل واقع ہوتا ہے۔ ایسے افراد کے لیے تحریکوں میں مواخذے کا ایک باقاعدہ نظام ہوتا ہے۔ اس بارے میں یہ خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ تحریک کی اعلیٰ قیادت اور عام رفقاء کے مابین مواخذے میں امتیازی سلوک نہ برتا جائے۔ یہ بات کسی بھی جماعت یا تحریک کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ تحریکی ڈھانچے کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے‘ کیونکہ جب کسی ادنیٰ کارکن کی غلطی جماعتی نظم میں دراڑیں پیدا کر سکتی ہے تو قائدین کی غلطی سے یقیناً اتنا بڑا شگاف پیدا ہو گا جس کا پُر کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا مؤاخذہ اور سرزنش کرتے وقت امتیازی سلوک قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات یاد رہے کہ اُمم سابقہ کی تباہی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔

⑤ کسی بھی شخصیت کی جہاں بہت بڑی خوبی اس کے کردار اور گفتار کی ہم آہنگی ہے وہاں اس کی بہت بڑی خرابی قول و عمل کا تضاد ہے‘ اور یہ تضاد کسی بھی سطح پر ہو‘ نقصان اور ضرر کا باعث ہے۔ حرکاتِ اسلامیہ کے کارکنان تو داعیانِ انقلاب ہوتے ہیں‘ اس لیے جب کسی داعی کی زندگی میں قول و فعل کا تضاد ہو گا تو جس طرح اس کی دعوت بے اثر ہو گی اسی طرح اس کی دعوت میں زور اور تیقن بھی نہیں ہو گا‘ کیونکہ دعوت دیتے وقت اس کا نفس اس کو اس پر ملامت کر رہا ہو گا۔

اس کا بہت بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص کسی بھی تحریک یا تنظیم میں مزید لوگوں کے داخلے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتا ہے‘ کیوں کہ عوام الناس کسی بھی تنظیم کے صرف خوش نما دستور یا بہترین منہج کی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہوتے بلکہ اس تحریک کے تربیت یافتہ افراد کے کردار و عمل کو دیکھ کر اس میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کرنے سے پہلے اپنا کردار پیش کیا ہے‘ جب اعلیٰ کردار کی گواہی مل گئی تب آپؐ نے دعوت پیش کی۔ لہٰذا قول و فعل کے تضاد سے بچنا ایک رفیق کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

⑥ کوئی بھی تحریک یا اُس کے کارکن غلطیوں اور کوتاہیوں سے مبرا نہیں ہیں۔ انسان سے غلطی سرزد ہونا کوئی بہت بڑا عیب نہیں ہے‘ لیکن اس پر ضد اور اصرار بہت بڑا جرم ہے‘ لہٰذا اپنی

غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیجیے اور جماعتی نظم کی طرف سے طلب کیے جانے پر اپنے آپ کو مؤاخذے کے لیے پیش کر دیجیے۔ اپنی حد تک بھی اپنے آپ کو طفل تسلیاں دینے کے بجائے اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے قبول کرنے پر آمادہ کریں اور آئندہ ان کے ازالہ کی پورے خلوص اور لگن سے بھرپور کوشش کریں۔ یاد رکھیے! جو اقوام اپنی غلطیوں کا جائزہ لے کر ان کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے ازالے کی کوشش کرتی ہیں وہی ترقی کی راہوں پر گامزن ہوتی ہیں، اور جو اپنے جرائم کو حقائق کا لبادہ اوڑھانے کی کوششوں میں لگ جاتی ہیں وہ تنزلی اور عدم استحکام کا شکار رہتی ہیں۔ لہٰذا ہمت کیجیے اور اپنی کوتاہیوں کا برملا اعتراف کرتے ہوئے ان کو دُور کرنے کی کوشش کیجیے۔ اسے اپنی انا اور جھوٹی عزت کا مسئلہ نہ بنائیے، یہ آپ کی شخصیت اور تحریک دونوں کے لیے زہر ہلاہل ہے۔

⑦ اسلامی تحریکوں کی ساری اساس خدا پرستی اور رضائے الٰہی پر ہے۔ اگر ہمارے کسی بھی کام کے کرنے میں محبت الٰہی اور کسی کام سے باز رہنے میں خوفِ الٰہی کا جذبۂ عاشقانہ کارفرما نہیں ہے تو ہمیں یہ سوچ لینا چاہیے کہ ہماری کوششوں اور محنتوں کا مرکز و محور اسلامی نہیں بلکہ شیطانی ہے اور ہمارے اندر طلب آخرت اور شوقِ دیدارِ الٰہی کی بجائے طلبِ دنیا اور تسکین لذات کا جذبہ کارفرما ہے۔ گویا وہی کام جو صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لیے تھا وہ شہرت اور خودنمائی کی خاطر انجام دیا جا رہا ہے۔ طرزِ عمل یہی رہے تو رفتہ رفتہ انسان راہِ ہدایت سے اس قدر دُور چلا جاتا ہے کہ واپسی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اگر یہ مرض کسی تحریک میں زیادہ بڑی سطح پر نمو پذیر ہونا شروع ہو جائے تو وہ تحریک جو کسی وقت خالص اسلامی اور انقلابی تحریک تھی محض ایک عام سیاسی اور ذاتی مفادات کے حصول کی تحریک بن جاتی ہے۔ اس لیے کارکنان تحاریکِ اسلامیہ کو چاہیے کہ محبت الٰہی کی جو شمع ان کے دلوں میں فروزاں تھی اس کی روشنی کو کسی قدر بھی کم نہ ہونے دیں، اور اگر وہ ضیاء مدھم پڑ رہی ہے تو انہی عقائد و نظریات کی شعوری سطح پر دوبارہ تجدید کریں اور محبت الٰہی کے ان چراغوں کو دوبارہ اس طرح روشن کریں کہ ان کی لو کسی طرح بھی مدھم نہ ہونے پائے اور الفت الٰہی کے یہ جذبات، تحریک کی کسی بھی نوعیت کی سرگرمیوں میں، چاہے سیاسی ہوں، معاشی ہوں یا معاشرتی، سرد نہ ہونے پائیں۔

کارکنان کے دلوں میں جب محبت الٰہی اس قدر جاگزیں ہو جائے گی تو وہ کسی بھی تحریکی مسئلہ میں، خواہ وہ ان پر گراں بار ہی کیوں نہ ہو، انحراف اور اختلاف کی شکل نہیں اختیار کریں گے، بلکہ رضائے الٰہی کی خاطر اسے برداشت کر کے اس کے مطابق عمل کی کوشش کریں گے۔ اس

لیے تحاریک کے ذمہ داران کو چاہیے کہ اپنے اور رفقاء کے دلوں سے عشق الٰہی کی تمازت کو کبھی ٹھنڈا نہ ہونے دیں۔

⑧ یہ ایک مسلمہ اَمر ہے کہ اسلامی تحریکیں اگر کوئی مقام حاصل کرتی ہیں تو وہ صرف کسی ایک فرد کی محنت اور جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں ہزاروں کارکنوں کی محنتیں، قربانیاں، خلوص اور دعائیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ تمام تر قربانیاں اور کاوشیں کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر ہوتی ہیں، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ قربانیاں دینے کے بعد وہ فوراً رنگ لائیں، اگرچہ ان کو جلد یا بدیر رنگ لانا ہی ہوتا ہے۔ وہ تحریک جس تسلسل کے ساتھ چل رہی ہوتی ہے وہ تسلسل، ولولہ اور جوش کارکنانِ تحریک کی ماضی کی محنتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس کو اپنے پاس اللہ کی امانت سمجھنا چاہیے اور ہمارے نظریات، افکار اور اعمال کی وجہ سے اس میں مزید ترقی ہونی چاہیے، نہ یہ کہ اس کی بنیادی ساکھ جو ہمیں بطور امانت ملی ہے تباہ و برباد ہو جائے اور ہم اس کو آئندہ نسلوں تک صحیح حالت میں منتقل کرنے میں ناکام رہیں۔ رفقاء تحاریک اسلامیہ کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ نہ جانے اس میں کتنے لوگوں کا خون، کتنی مقدس ہستیوں کا پسینہ اور کتنے اعلیٰ دماغوں کے نظریات اور افکار شامل ہیں! اس لیے ہر ایسی تخریبی کارروائی کا جس سے تحریک کا بنیادی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے، سختی سے نوٹس لیا جائے اور اس کے فوری ازالے کی پوری تندہی سے کوشش کی جائے، تاکہ ہم صحیح طور پر انتقالِ امانت کے اس عمل سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ورنہ ہم گزشتہ اور آئندہ نسلوں کے مجرم ہوں گے اور ہمیں اس عظیم ملی جرم کی کڑی سزا بھگتنی پڑے گی۔"

⑨ اسلام میں ذمہ داریوں کی تفویض کا تصور یہ ہے کہ کسی فرد کے پاس کوئی بھی عہدہ یا ذمہ داری اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کی طرف سے اللہ کی ایک امانت ہے، اور امانت کا پورا پورا حق یہ ہے کہ اس ذمہ داری کو سو فیصد ادا کیا جائے۔ اگر کوئی شخص اس میں کوتاہی برتتا ہے تو وہ اللہ کے ہاں خائن اور مجرم قرار پاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے اسلاف رحمۃ اللہ علیہم انتظامی ذمہ داریوں سے، وہ جس قسم کی بھی ہوں، اپنے آپ کو بچاتے تھے، اور بعض دفعہ ان کو قبول نہ کرنے پر انہیں سزائیں بھی بھگتنی پڑی ہیں۔ اسی لیے سنت میں اس بات کا حکم ہے کہ جو فرد کسی ذمہ داری کا مطالبہ کرے گا وہ اُسے تفویض نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا تحاریک اسلامیہ میں بھی عہدوں کو امانت ہی سمجھا جانا چاہیے اور اس بارے میں محاسبۂ الٰہی کا خوف ہر وقت دل میں رہنا چاہیے۔ عہدوں کی سیاست اور ان کے حصول کی تمنا کی شریعت میں کوئی گنجائش موجود نہیں ہے

اور نہ ہی اسلامی تحریکوں میں ہونی چاہیے۔ لہٰذا نہ صرف ایسی خواہشوں سے پرہیز کیا جائے بلکہ ایسے فتنوں سے بچنے کے لیے مسلسل توبہ و استغفار کرنی چاہیے۔

⑩ جس طرح میدانِ قتال میں پیٹھ دکھا کر بھاگنا انتہائی سخت گناہ ہے، بالکل اسی طرح تحریکی زندگی کے دوران جب کبھی عملی کشمکش کا وقت آئے تو اس وقت اپنے آپ کو دنیاوی نقصان سے بچانے کی غرض سے تحریک سے علیحدہ کر لینا یا کم از کم اس جدوجہد میں شمولیت اختیار نہ کرنا ہماری نظر میں اسی طرح کا گناہ ہے۔ آپ نے تحریک میں رہتے ہوئے اپنی شخصیت کی شعوری، فکری اور عملی سطح پر جو تعمیر کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مشکل وقت میں بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کو اس کے لیے وقف کر دیں۔ یہ بات انتہائی غیر مناسب ہے کہ فوائد کے حصول تک تو تحریک میں بہت سرگرم رہے اور جب تحریک کو ضرورت پیش آئی تو راہِ فرار اختیار کر گئے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ انسان تنظیمی وابستگی کی وجہ سے معاشرے کی جن گندگیوں، آلائشوں اور فتنوں سے محفوظ رہتا ہے تنظیم سے علیحدگی کی صورت میں ان میں پڑنے کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔ ہم نے بہت سے ایسے افراد دیکھے ہیں کہ ان کی زندگی تحریکی وابستگی سے پہلے بہت مسرفانہ اور عیاشانہ تھی۔ تحریک میں شمولیت کے بعد وہ ان مشاغل سے تائب ہو گئے اور اپنے وسائل کو دینی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ تحریک سے دوری کی وجہ سے انہوں نے وہی طور طریقے دوبارہ اپنا لیے۔ اسی طرح کی مثال ان خواتین کی ہے جو دینی تحریک سے وابستہ ہوئیں تو صوم و صلوٰۃ اور شرعی پردہ کی پابندی کرنے لگیں، لیکن جب جماعت سے علیحدگی اختیار کی تو نہ ان کی عبادات باقی رہیں اور نہ پردہ۔ چنانچہ تحاریکِ اسلامیہ سے وابستہ ایسے حضرات جو کسی وجہ سے تحریک سے علیحدگی کے بارے میں غور کر رہے ہوں، ان کے لیے دعوتِ فکر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی متاعِ دُنیوی کو بچاتے بچاتے متاعِ ایمانی اور اخروی کو بھی نہ گنوا بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

آخر میں عرض ہے کہ اس پوری تحریر سے مقصود صرف اور صرف ایک دینی خیر خواہی ہے، اس میں کسی کو نشانہ بنانا قطعاً پیش نظر نہیں۔ لہٰذا مفہوم کی ادائیگی میں اگر کہیں الفاظ شائستگی کا دامن کھو بیٹھے ہوں تو ہم قارئین سے اور اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کے متمنی ہیں۔ (والعفو عند کرام الناس مقبول)

* * *

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار

قرآن و حدیث اور تاریخ کے آئینے میں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام علی، کنیت ابوالحسن اور ابوتراب، لقب حیدر۔ والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ آپؐ کے اوّلین کفیل آپؐ کے دادا عبدالمطلب تھے۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو وہ وصیت کر گئے کہ محمد ﷺ کی کفالت ابوطالب کریں۔ ابوطالب قبیلہ کے سردار تھے مگر وہ صاحبِ ثروت نہ تھے۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کو اپنے فرزند سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اسی طرح کی محبت آپ کی چچی کو بھی آپؐ کے ساتھ تھی۔

چالیس سال کی عمر میں جب رسول اللہ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اُس وقت حضرت علیؓ رسول اللہ ﷺ کے گھر کے فرد اور آپ کے زیرِ کفالت تھے۔ آپؐ نے اپنے گھر میں نبوت کا اظہار کیا تو حضرت علیؓ جو اُس وقت صرف دس سال کے تھے، حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ اس سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اسلام لا چکی تھیں۔ ابتدا میں حضرت علیؓ بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چھپ چھپ کر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ جب ابوطالب کو علم ہوا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حقیقتِ حال دریافت کی۔ آپؐ نے بتایا کہ چچا جان مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے اور میں آپ کو بھی قبول اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اس پر ابوطالب نے کہا کہ میں اپنے آباء واَجداد کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا لیکن بخدا جب تک میں زندہ رہوں گا تم کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے یہ عہد آخری حد تک پورا کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ پر مکہ والوں نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور اُن کا معاشرتی مقاطعہ کر کے انہیں شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو چچا ابوطالب نے بھتیجے کو تنہا نہ چھوڑا بلکہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ تین سال تک شعب ابی طالب میں بھوک پیاس برداشت کی۔

رسول اللہﷺ قریش اور قبائل عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ ادھر قریش کی دشمنی اور مخالفت بھی زور پکڑتی گئی۔ جب قریش نے بدسلوکی کی انتہا کر دی اور حق کی مخالفت اور رسول اللہﷺ کو ایذائیں پہنچانے میں حد سے گزر گئے تو رسول اللہﷺ طائف کی طرف چلے گئے تاکہ اہل طائف کو اسلام کی دعوت دیں، مگر وہاں بھی آپ کی بات نہ سنی گئی، بلکہ وہاں سے آپﷺ لہولہان ہو کر مکہ واپس آئے۔ یہاں قریش نے دارالندوہ میں رسول اللہﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہﷺ کو خبردار کر دیا اور ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ آپﷺ نے ہجرت کے لیے رختِ سفر باندھا۔ جس بستر پر رات کو قاتلانہ حملہ ہونے والا تھا اس بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹایا اور خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔

خطرے کی رات رسول اللہﷺ کے بستر پر لیٹ کر گہری نیند سونا حضرت علیؓ کا جرأت، شجاعت اور وفاداری کا عدیم المثال واقعہ ہے۔ جب صبح تک رسول اللہﷺ گھر سے باہر تشریف نہ لائے تو انہوں نے جھانک کر دیکھا تو بستر پر علی تھے۔ چنانچہ وہ بے نیل مرام واپس ہو کر رسول اللہﷺ کے تعاقب میں نکلے، مگر آپؐ تک نہ پہنچ سکے۔ آپﷺ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ رسول اللہﷺ کے پاس کفار کی امانتیں تھیں۔ حضرت علیؓ وہ امانتیں مالکوں کے سپرد کر کے چند دن کے بعد عازمِ مدینہ ہوئے۔ مدینہ پہنچ کر رسول اللہﷺ نے بے سروسامان مہاجرین اور مدینہ کے رہائشیوں کے درمیان رشتۂ مؤاخات قائم فرمایا تو رسول اللہﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی انصاری کا بھائی بنانے کے بجائے اپنا بھائی قرار دیا۔

ہجرت کے دوسرے سال رسول اللہﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ دونوں پر پانی چھڑکا اور دعائیں دیں۔ اس عظیم جوڑے کی شادی انتہائی سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ رخصتی کے وقت نہ کوئی دھوم دھام تھی نہ کسی رسم و رواج کی پابندی۔ رسول اللہﷺ نے ایک دبیز چادر میں اپنی لختِ جگر کو گھر سے رخصت کیا۔ یہ وہ حالات تھے جب خود رسول اللہﷺ کے گھر میں فاقہ کشی تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی غربت اور ناداری کے سوا کچھ نہ تھا۔ (مسند امام احمد بن حنبل)

گھر کے کام کاج خصوصاً چکی پیستے پیستے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پریشان ہو گئی تھیں۔ اُن کو اطلاع ملی کہ رسول اللہﷺ کے پاس کچھ لونڈی غلام آئے ہیں، چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے ایک خادم کا تقاضا کیا۔ اس پر رسول اللہﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو تمہارے مانگنے کی چیز سے بڑھ

کر نہ دوں؟ اور وہ یہ کہ جب بستر پر جانے لگو تو تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ (بخاری، کتاب الجہاد)

ایک دفعہ بیٹی کے گھر آئے، پوچھا علی کہاں ہیں؟ کہنے لگیں مسجد میں گئے ہیں۔ آپؐ نے باہر نکل کر مسجد میں دیکھا تو وہاں انہیں اس حال میں لیٹے ہوئے پایا کہ پشت پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے مٹی صاف کی اور دو مرتبہ فرمایا: ((اجلس یا اباتراب!)) ”ابوتراب! اُٹھ کے بیٹھو“۔ (صحیح بخاری)

۲ھ میں جنگ بدر ہوئی۔ انفرادی مقابلوں میں حضرت علیؓ کے سامنے ولید بن عتبہ آیا۔ حضرت علیؓ نے پہلے ہی وار میں اسے جہنم واصل کیا۔ (سیرت ابن ہشام)

غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار ذوالفقار حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دے دی اور پھر زندگی بھر واپس نہ لی۔ (السیرۃ النبویہ، از ابوالحسن علی ندوی)

جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ کا علَم حضرت علیؓ کے پاس ہی تھا۔ (الطبقات الکبریٰ)

ہجرت کے تیسرے سال شوال ۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا جس میں تیراندازوں کے درّہ چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو زخم آیا۔ حضرت علیؓ نے ڈھال میں پانی لے کر آپ کے زخم کو دھویا۔ اس جنگ میں علیؓ میمنہ سنبھالے ہوئے تھے۔ مصعب بن عمیرؓ کی شہادت کے بعد علَم آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ آپؓ نے اس جنگ میں خوب دادِ شجاعت دی اور کئی مشرکوں کو قتل کیا۔ (البدایہ والنہایہ)

شوال ۵ھ میں غزوۂ احزاب پیش آیا۔ دشمن نے دور و نزدیک سے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دفاعی حکمت عملی کے طور پر مدینہ میں داخلے کے راستے کو خندق کھود کر محفوظ کر لیا۔ ایک تنگ جگہ سے کچھ دشمن خندق عبور کر کے مدینہ میں داخل ہو گئے جن میں عمرو بن عبدوُدّ بھی تھا جو اکیلا ہزار شہسواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے مدمقابل کے لیے للکارا تو حضرت علیؓ مقابلہ پر آئے۔ عمرو بن عبدوُدّ اتنا متکبر تھا کہ اپنے گھوڑے سے اتر کر اُن کے مقابلہ میں آ گیا۔ دوبدو لڑائی ہوئی۔ دفعتاً حضرت علیؓ کی تلوار کے وار نے اس کا کام تمام کر دیا اور مغرور عمرو بن عبدوُدّ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ”

۶ھ میں بیعت رضوان ہوئی اور صلح نامہ حدیبیہ تحریر ہوا۔ حضور ﷺ لکھوا رہے تھے اور حضرت علی لکھ رہے تھے۔ جب فریق معاہدہ کے طور پر ”محمد رسول اللہ“ (ﷺ) لکھا گیا تو

کفار کے نمائندہ سہیل نے کہا کہ ''محمد بن عبداللہ'' لکھا جائے۔ رسول اللہﷺ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ پہلا لکھا ہوا مٹا دیں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ بخدا میں تو اس کو نہیں مٹا سکتا۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا مجھے بتاؤ ''رسول اللہ'' کہاں لکھا ہے' میں خود مٹائے دیتا ہوں۔ (صحیح مسلم)

۷ھ میں غزوۂ خیبر ہوا۔ خیبر مدینہ سے ستر میل دور ایک یہودی کالونی تھی' جو مضبوط قلعوں پر مشتمل تھی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا گڑھ تھا۔ ادھر سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ رسول اللہﷺ چودہ سو صحابہ کو ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب محاصرے نے طول پکڑا اور القموص کے مضبوط قلعے کی تسخیر باقی رہ گئی تو آپؐ نے فرمایا کل جھنڈا اسی کے سپرد ہوگا جس کے ہاتھ سے خیبر فتح ہوگا۔ سب انتظار میں تھے کہ یہ اعزاز کس کے حصے میں آتا ہے۔ حضورﷺ نے حضرت علیؓ کو بلایا۔ ان کی آنکھیں دکھتی تھیں۔ آپؐ نے اُن کی آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا' دُعا کی اور جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ حضرت علیؓ قلعہ میں داخل ہوئے' مشہور جنگجو مرحب مقابلے پر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیے' حضرت علیؓ کا وار کامیاب رہا۔ مرحب کا خود اور سر دونوں کٹ گئے۔ اس پر خیبر فتح ہوگیا۔

۸ھ میں رسول اللہﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور راز کو خفیہ رکھا۔ حاطب بن ابی بلتعہؓ مہاجر نے قریش مکہ کو خط کے ذریعے حملے کی اطلاع دینا چاہی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو آگاہ کر دیا کہ ایک عورت یہ خط لے کر مکہ جا رہی ہے۔ چنانچہ آپﷺ نے حضرت علی اور حضرت زبیرؓ کو گھوڑوں پر دوڑایا کہ اس عورت سے خط برآمد کر کے لے آؤ۔ ان دونوں حضرات نے خاخ کے مقام پر اس عورت کو جا لیا۔ پہلے تو اُس نے انکار کیا' بعد ازاں جب یہ حضرات سختی سے پیش آئے تو اپنے سر کے بالوں سے نکال کر خط ان کے حوالے کر دیا۔ جب وہ خط رسول اللہﷺ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے حاطبؓ سے پرسش کی۔ حاطبؓ نے غلطی تسلیم کر لی۔ آپؐ نے ان کا عذر قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے حضور! مجھے اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپﷺ نے فرمایا: حاطب بدری صحابی ہے' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدریوں کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں؟ (صحیح بخاری)

۸ھ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق رسول اللہﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے چلے اور مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے' جہاں سے آٹھ سال پہلے نکالے گئے تھے۔ مسلمانوں کا جوش و خروش اور خوشی دیدنی تھی۔ رسول اللہﷺ نے حرم کے اندر نصب کیے ہوئے بت

توڑنے شروع کیے۔ آپؐ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ پڑھتے جاتے تھے۔ پھر کعبہ کے اندر سے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی مورتیوں کو الگ کیا۔ ایک پیتل کا بت رہ گیا جو کافی اونچا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو کندھوں پر اٹھا کر بلند کیا جنہوں نے حسب ارشادِ نبویؐ اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ (بخاری)

۹ھ میں جب نبی اکرم ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت علیؓ کو اپنا جانشین بنا کر مدینہ میں چھوڑا۔ حضرت علیؓ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: اے علی! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہاری حیثیت وہی ہو جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے ساتھ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (صحیح بخاری)

۹ھ کے حج میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر حج بنا کر مکہ روانہ کیا۔ بعد ازاں سورۂ براءت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو پیچھے بھیجا کہ قربانی کے دن لوگوں کو منیٰ کے اندر یہ آیات سنا دیں اور انہیں آگاہ کر دیں کہ کوئی کافر جنت میں نہ جا سکے گا' نیز اس سال کے بعد کوئی مشرک نہ حج کر سکے گا اور نہ برہنہ طواف کر سکے گا......

۱۱ھ میں نبی مکرم ﷺ نے اپنی وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع ادا کیا۔ اس میں آپؐ نے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور ۳۷ اونٹ حضرت علیؓ کو ذبح کرنے کو کہا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور سو کا عدد پورا کیا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق منیٰ میں گزار کر آپؐ نے طوافِ وداع کیا اور پھر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں غدیر خم کے مقام پر ایک خطبہ دیا جس میں حضرت علیؓ کی خصوصیت اور شان کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ''اے اللہ! میں جس کا دوست ہوں تو یہ علی بھی اس کے دوست ہیں۔ اے اللہ! جو علی سے دوستی رکھے تو اس سے دوستی فرما اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس کے ساتھ دشمنی کا معاملہ فرما''۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو مبارک باد دی۔ (احمد)

حضرت علیؓ کی نسبت یہ الفاظ کہنے کا سبب یہ تھا کہ بعض لوگوں نے ان کی بے جا شکایت کی تھی اور آپؐ نے اس کے جواب کے طور پر حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی۔

حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے۔ ابتدائے ربیع الاوّل میں

بیمار ہوئے۔ حضرت علی ؓ پوری تندہی کے ساتھ آپ ؐ کی خدمت اور تیمارداری میں لگ گئے۔ اس دوران جب آپ مسجد میں نہ جا سکتے تھے تو حضرت ابوبکر ؓ کو مقرر کیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کی زندگی میں مسجد نبوی میں سترہ نمازوں کی امامت کرائی۔ مختصر علالت کے بعد ۱۲/ربیع الاول پیر کے دن آپ ؐ دنیائے فانی سے دارالبقا کی طرف مراجعت فرما گئے۔ حضرت علی ؓ کے ہاتھوں آپ ؐ کی تجہیز و تکفین ہوئی۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ اوّل کے طور پر لوگوں نے حضرت ابوبکر ؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ چونکہ خلیفہ کے چناؤ کی مجلس میں حضرت علی ؓ موجود نہ تھے اس لیے ان کو ابوبکرؓ سے شکوہ رہا۔ دوسرے حضرت فاطمہ ؓ کی سوگوار زندگی نے اُن کو خانہ نشین بنا دیا تھا۔ چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمہ ؓ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے حضرت ابوبکر ؓ کی بیعت کر لی اور خلافت صدیقی کے دوران پورے طور پر حضرت ابوبکر ؓ کے مشیر خاص رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی کچھ ازواج نے میراث طلب کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت عائشہ ؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہم وارث نہیں بناتے، ہم نے جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔ حضرت فاطمہ ؓ نے خیبر کے خمس میں سے جو کچھ بچا تھا اُس کا اور فدک اور مدینہ کی غنیمت کا ابوبکر صدیق ؓ سے مطالبہ کیا مگر انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کا فرمان سنا دیا کہ ''ہم (انبیاء کرام ؑ) وارث نہیں بناتے، ہم نے جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے'' اور کہا کہ آلِ محمدؐ اس مال سے اپنی ضروریات پوری کریں گے، میں آپ ﷺ کے صدقہ کیے ہوئے مال میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ (صحیح بخاری)

اندریں حالات حضرت فاطمہ ؓ کو ابوبکر صدیق ؓ سے تاحیات شکوہ رہا اور یہ چھ ماہ کا عرصہ تھا۔ جب حضرت فاطمہ کی رحلت کا وقت آیا تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ اُن کی عیادت کے لیے گئے۔ بنت الرسول سے معذرت کی اور وہ اُن سے خوش ہو گئیں۔ جب حضرت فاطمہؓ کی وفات ہو گئی تو نماز جنازہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پڑھائی۔ (طبقات ابن سعد)

جب تک حضرت فاطمہ ؓ زندہ رہیں حضرت علی ؓ نے کوئی اور نکاح نہیں کیا۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ حضرت علی ؓ نے ابوبکر صدیق ؓ سے شروع ہی میں بیعت کر لی تھی اور اُن کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔ البتہ حضرت فاطمہؓ کی وفات تک کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ چھ ماہ بعد پھر بیعت کی جو پہلی بیعت کی توثیق تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؓ نے خلافت صدیقی کے دوران حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اور تو اور حضرت علیؓ نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کے ایک بیٹے محمد نامی کو گود لیا‘ جو تاریخ میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعدازاں اسے ایک علاقے کی گورنری کے اہل بھی سمجھا۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ حضرت علیؓ نے خلافت فاروقی کو دل و جان سے قبول کیا اور حضرت عمرؓ کے مشیر خاص اور معاون رہے۔ دونوں اس قدر شیر و شکر تھے کہ حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی اُمِ کلثوم حضرت عمرؓ کی زوجیت میں دے دی۔ (مجالس المؤمنین از قاضی نوراللہ الشوستری)

جب حضرت عمرؓ بیت المقدس کے سفر پر گئے تو اپنی جگہ حضرت علیؓ کو قائم مقام خلیفہ بنا کر گئے۔ (تاریخ ابن خلدون)

نہاوند کا معرکہ پیش آیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی رائے کو دوسروں کی رائے پر ترجیح دی اور ان کی تجویز پر عمل کیا۔ حضرت علیؓ حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں انتہائی اچھی رائے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام عمر رکھا۔ یہ عام سی بات ہے کہ لوگ اپنے بچوں کے نام اچھے آدمیوں کے ناموں پر ہی رکھتے ہیں۔ جس شخص سے نفرت ہو اس کے نام پر تو کوئی بھی اپنے بیٹے کا نام نہیں رکھتا۔ حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی۔ جسد مبارک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ آئے‘ چہرے سے کپڑا ہٹایا اور کہا اے ابوحفص اللہ کی رحمتیں ہوں آپ پر۔ واللہ! رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ میں اللہ کے سامنے جانا پسند کروں۔ (احمد)

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے۔ حضرت علیؓ ان کے بھی مشیر و معاون رہے۔ جب حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوہ ہوا تو حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی بھرپور حمایت کی۔ باغیوں نے امیر المؤمنین عثمان غنیؓ کے گھر کی ناکہ بندی کر لی تو حضرت حسن اور حسینؓ باغیوں کو روک رہے تھے‘ مگر حضرت عثمان غنیؓ ان کو قسم دے کر کہہ رہے تھے کہ کوئی کارروائی نہ کریں اور اپنے گھر چلے جائیں۔ حضرت علیؓ نے بھی مدافعت اور مقابلے کی اجازت طلب کی مگر حضرت عثمانؓ نے اجازت نہ دی۔ باغی مکان کے پیچھے سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے اور حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد لوگوں کے شدید اصرار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی۔ عثمانی خلافت کا نصف آخر شورش اور بغاوت میں گزرا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی ہی اُس وقت جب حالات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے خلافت کا بار سنبھالتے ہی آپ کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ اسلامی سلطنت کی توسیع کا کام تو بالکل رک گیا۔ مسلمان آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ خونریز لڑائیوں میں ہزاروں اہل اسلام جاں بحق ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے سب سے پہلا مطالبہ یہ رکھا گیا کہ وہ قاتلین عثمان سے بدلہ لیں، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف تھا کہ قصاص کا اجراء بغیر کسی دعویٰ اور بغیر کسی دلیل اور حجت کے صحیح نہیں۔ (الاصابہ)

حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما قصاصِ عثمانؓ کے مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ وہ دونوں مکہ گئے اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو حج کے لیے آئی ہوئی تھیں، اُن سے ملے اور ان کو ساتھ لے کر بصرہ آئے اور حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگے۔ حضرت علی، عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے درمیان مذاکرات ہوئے، حضرت علیؓ نے اُن کو مطمئن کر دیا۔ لیکن یہ بات تخریب کار سبائیوں کو پسند نہ آئی۔ مفسدین نے رات کے وقت موقع پا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر پر یکا یک حملہ کر دیا۔ ہنگامہ کارزار اس قدر گرم ہوا کہ طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ نتیجہ حضرت علیؓ کے حق میں نکلا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور اُدھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اصل حقیقت کا علم ہوا تو زار و قطار روئے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس جنگ کو جنگِ جمل کہتے ہیں، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار ہو کر میدان میں آئی تھیں۔ یہ جنگ بصرہ کے مقام پر ۳۶ھ میں ہوئی۔ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی مقتول ہوئے۔ حضرت عائشہؓ زندگی بھر اس واقعہ کو یاد کر کے روتی اور پچھتاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ کاش میں یوم الجمل سے پہلے مر گئی ہوتی۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے حاکم تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کر دیا اور حضرت علیؓ کی طرف سے اپنی معزولی کے حکم کو تسلیم نہ کیا بلکہ اپنے بہت سے حامی پیدا کر لیے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل شام سے جنگ کا ارادہ کر لیا اور کوفہ سے شام کی طرف چل پڑے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے حامیوں کو لے کر فرات کی طرف روانہ ہوئے۔ صفین کے مقام پر دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔ مصالحت نہ ہو سکی اور بڑی جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کئی دن تک جاری رہی۔ شامی شکست کھا رہے تھے کہ انہوں نے نیزوں پر

قرآن اٹھایا اور جنگ بند ہوگئی اور مذاکرات شروع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے تحکیم منظور کر لی‘ مگر ان کے اکثر ساتھیوں نے معاملے کو دوسرا رنگ دے کر ’’لاحکم الا اللہ‘‘ کی صدا بلند کی۔ یہ لوگ ایک بڑی جماعت تھے۔ بعد میں یہ خوارج مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑ دی۔ حضرت علیؓ نے ان خارجیوں کی تنبیہہ کی خاطر نہروان کا قصد کیا۔ نہروان کے مقام پر خارجیوں سے جنگ ہوئی۔ سب خارجی ہلاک ہو گئے‘ صرف دس لوگ بچے۔ یہ لوگ روپوش ہو گئے اور سازشیں کرتے رہے۔ ان ہی کے ایک آدمی عبدالرحمٰن بن ملجم نے بعدازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ (فتح الباری) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار سال نو ماہ خلافت کی۔ آپؓ کی نماز جنازہ آپؓ کے بیٹے حضرت حسنؓ نے پڑھائی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بچپن ہی سے رسول اللہ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی اور آپؓ شروع ہی سے نبوی تربیت میں رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا۔ آپ اُن چند صحابہ میں سے تھے جنہیں پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف موقعوں پر آپ کی فضیلت بیان کی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ جب فتح یاب ہو کر واپس آئے تو لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آپؐ سے شکایت کی جو کہ غلط فہمی کی بنا پر تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے شکایت کرنے والوں پر ناگواری ظاہر فرمائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ’’علی مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں‘ اور وہ ہر ایمان والے کا ولی ہے‘‘۔ (جامع ترمذی)

رسول اللہ ﷺ ہجرت کے بعد جب مدینہ پہنچے تو مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم فرمایا۔ ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی قرار دیا۔ اُس وقت حضرت علی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ عرض کیا آپؐ نے تمام اصحاب کے درمیان رشتۂ مواخاۃ قائم فرما دیا ہے مگر میرے اور کسی دوسرے کے درمیان آپؐ نے مواخاۃ قائم نہیں فرمائی۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم میرے بھائی ہو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (جامع ترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں قسم ہے اُس ذات کی جو دانے کو پھاڑ کر پودا نکالتی ہے اور جس نے جانداروں کو پیدا کیا۔ نبی اُمی ﷺ نے خصوصی طور پر مجھ سے فرمایا تھا کہ مجھ سے وہی محبت کرے گا جو مؤمن صادق ہوگا اور وہی شخص مجھ سے بغض رکھے گا جو منافق ہوگا۔ (مسلم)

حضرت علی ؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اے علی! تمہیں عیسیٰ ابن مریم سے خاص مشابہت ہے۔ یہودیوں نے ان کے ساتھ بغض وعداوت کا رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ ان کی ماں مریم صدیقہ پر بہتان لگایا اور نصاریٰ نے ان کے ساتھ ایسی محبت کی کہ ان کو اس مرتبہ پر پہنچایا جو مرتبہ ان کا نہیں تھا۔‘‘ حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ دو طرح کے آدمی میرے بارے میں ہلاک ہوں گے۔ ایک محبت میں غلو کرنے والے جو میری وہ خوبیاں بیان کریں گے جو مجھ میں نہیں ہیں‘ دوسرے بغض وعداوت میں حد سے بڑھنے والے‘ جن کی عداوت ان کو اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ مجھ پر بہتان لگائیں۔ (مسند احمد)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اُس کا ظہور حضرت علی ؓ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ خوارج کا فرقہ پیدا ہوا جو عداوت اور مخالفت میں اس حد تک چلا گیا کہ آپ کو بے دین اور واجب القتل قرار دیا۔ اور انہی کے ایک شخص ابن ملجم نے آپؓ کو شہید کر دیا اور اپنے اس عمل کو اعلیٰ درجہ کا جہاد فی سبیل اللہ سمجھا۔ اس کے برعکس آپ کی محبت میں اس حد تک غلو کرنے والے بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے آپ کو مقامِ الوہیت تک پہنچا دیا اور ایسے بھی جنہوں نے آپ کو نبوت و رسالت کے لائق سمجھا۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ جبریل وحی نبوت لے کر غلطی سے محمد ﷺ کے پاس چلے گئے‘ اللہ نے تو علی ؓ کے پاس بھیجا تھا۔ اس عقیدے کے لوگ آج بھی موجود ہیں‘ وہ حضرت علی ؓ کی اولاد میں امامت مانتے ہیں اور ہر امام کو معصوم سمجھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو حضرت علی ؓ‘ اپنی بیٹی فاطمہ ؓ اور ان کی اولاد سے بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حسین ؓ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جس نے مجھ سے محبت کی اور ان دونوں اور ان کے والد والدہ سے محبت کی تو وہ قیامت کے دن جنت میں میرے درجہ میں میرے ساتھ ہو گا۔ (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ سے یقیناً حضرت علیؓ کی بڑی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے‘ مگر اس سے دوسرے صحابہؓ کے فضائل سے چشم پوشی کرنا قرین انصاف نہیں۔ اُمت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکر صدیق ؓ کا مقام سب سے بلند ہے۔ ان کے بعد عمر ؓ اور عثمان ؓ ہیں اور پھر حضرت علی ؓ۔ حضرت ابوبکر ؓ جب رسول اللہ ﷺ کے بعد امیر المؤمنین بنے تو حضرت علی ؓ نے اُن کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ اگر اُن کی خلافت جائز نہ ہوتی تو حضرت علی ؓ اسے کبھی تسلیم

نہ کرتے‘ جیسا کہ اُن کے فرزند حضرت حسینؓ نے یزید کی خلافت کو ناجائز سمجھا اور تسلیم نہ کیا۔ ابوبکرؓ کے بعد عمرؓ اور عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ بھی بھرپور تعاون کیا اور اُن کی خلافت کو حق سمجھا۔ محمد بن حنفیہ حضرت علیؓ کے بیٹے ہیں جن کی والدہ کا نام خولہ تھا جو حنفیہ قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ اُمت میں رسول اللہﷺ کے بعد سب سے بہتر و افضل کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا ابوبکرؓ! میں نے کہا ان کے بعد کون؟ تو انہوں نے فرمایا عمرؓ! محمد بن حنیفہ کہتے ہیں کہ پھر مجھے خطرہ ہوا کہ اگر میں اسی طرح دریافت کروں کہ عمر کے بعد کون؟ تو یہ نہ کہہ دیں کہ عمر کے بعد عثمانؓ۔ اس لیے میں نے سوال اس طرح کیا کہ پھر عمر کے بعد آپؓ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں کا ایک آدمی ہوں۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہﷺ کے زمانے میں ابوبکر کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے‘ ان کے بعد عمر‘ ان کے بعد عثمان۔ پھر ہم رسول اللہﷺ کے تمام اصحاب کو چھوڑ دیتے تھے۔ ان کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ (صحیح بخاری) آج تک یہی فیصلہ صائب اور قرین انصاف ہے۔ OO

بقیہ: آخرت

درس ہے جس سے دنیا کی بے ثباتی اور اپنی آخری منزل کا یقین ہوتا ہے۔

حسن البناء شہیدؒ لکھتے ہیں:

> ”شیخ محمد ابوشوشہ کا ہم پر بڑا احسان ہے...... کہ وہ ہمیں قبرستان لے جاتے ...... پھر وہ ہمیں کھدی ہوئی قبریں دکھاتے اور ہمیں یاد دلاتے کہ بالآخر ہم اسی تاریک غار کے اندر بسیرا کریں گے۔ بعض اوقات وہ ہم میں سے کسی ایک کو حکم دیتے کہ قبر میں اُتر جاؤ اور چند گھڑی وہاں لیٹ کر اپنا انجام یاد کرو۔ قبر کی تاریکی (تنہائی) اور قبر کی وحشت کا تصور کرو۔ ابوشوشہ خود بھی زاروقطار روتے اور ہماری آنکھیں بھی اشک بار ہو جاتیں۔ ہم بڑے خشوع کے لمحات میں‘ عجیب ولولے اور حضوریٔ قلب کے ساتھ اور ندامت و عزم کے جذبات میں مستغرق ہو کر توبہ کو تازہ کرتے۔(۲۱)

---

(۲۱) حسن البناء شہید کی ڈائری‘ ص ۱۳۹۔

ایک سفر بنگلہ دیش کا!

عطاء الرحمٰن عارف

راقم السطور نے گزشتہ دنوں بنگلہ دیش کا دعوتی و مطالعاتی دورہ کیا۔ اس کا اصل مقصد تو غازی پور کے علاقہ دیونا میں واقع مدرسہ دعوت الاسلام کے سالانہ پروگرام میں شرکت تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک وعدہ پورا کرنے کا ذریعہ بھی بنا دیا جو ہم نے قاری عبدالرحمٰن صاحب اور مفتی نعمت اللہ صاحب سے کر رکھا تھا۔ قاری صاحب نے بیس سال جامع مسجد شادمان کالونی‘ لاہور میں امامت کی تھی جبکہ مفتی نعمت اللہ صاحب بھی اسی مسجد میں کافی عرصہ خطابتِ جمعہ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ میرے استاد محترم نے اس بات کی خواہش کی تھی کہ میں واپسی پر اپنے تاثرات تحریری طور پر رقم کروں۔ اسی خواہش کو حکم سمجھ کر میں نے اس کام کا آغاز کیا۔ بارہ روزہ سفرنامہ تحریر کرنے کے لیے میرے ذہن میں تین مختلف جہتیں ہیں: مدارس میں کام کی نوعیت‘ سیاسی حالات اور تاریخی مقاماتِ سفر۔

سفر کا آغاز کراچی سے ہوا۔ ہمارا گروپ چار افراد پر مشتمل تھا‘ تاہم ہمیں ایک بزرگ ہستی خالد ظفر اللہ چودھری صاحب کا ساتھ بھی میسر تھا جنہوں نے دورانِ سفر مسنون دعاؤں اور اذکار کے ساتھ ہم سب کو مصروف رکھا۔ دینی واقعات سناتے رہے اور قرآنی دعاؤں کی بھی تعلیم دی۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر مفتی نعمت اللہ اور قاری عبدالرحمٰن موجود تھے۔ ہم ان کے ساتھ مدرسہ سبحانیہ پہنچے جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ یہ مہمان خانہ مفتی سبحان محمود صاحب کے زیر استعمال بھی رہا تھا۔ دورانِ قیام ہم نے مدرسہ دعوت الاسلام کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی۔ اس کے بعد مدرسہ سبحانیہ کے ’’یومِ والدین‘‘ میں شریک ہوئے۔ یہاں سے ہم نواکھالی گئے اور پھر دریائی راستہ استعمال کر کے ایشا گھاٹ اور لکھی پور پہنچے۔ مرزا خان اور دولت خان میں ایک مدرسہ کی تقریب میں شرکت کی۔ ہمارا سفر بنگلہ دیش کے شمالی علاقہ بریسال میں لال موہن سے ہوتا ہوا ضلع بھولا پر ختم ہوا۔ واپسی کا سفر نہایت دلچسپ رہا جب ہم

براستہ دریا ایک اسٹیمر میں ۱۵ گھنٹے کا سفر کر کے واپس ڈھاکہ پہنچے۔

شہروں اور مضافاتی علاقوں میں سفر کے دوران یہ محسوس کیا گیا کہ پورا ملک نہایت خوبصورت مقامات سے بھرا ہے۔ سرسبز و شاداب میدان‘ بلند و بالا پہاڑ‘ خوبصورت وادیاں‘ جنگلات و باغات اور بہتے دریا اس ملک کا اصل حسن ہیں۔ شہروں میں آزاد خیالی نظر آتی ہے مگر دیہات اسلامی زندگی کا عکس ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ متوسط طبقہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ ایک جانب عالیشان عمارتیں اور نئے ماڈل کی غیر ملکی گاڑیاں ہیں تو دوسری جانب سائیکل رکشہ جیسی سواری ہے جو اس ظلم کا اظہار ہے کہ انسان انسان کو کھینچتا ہے۔ ایک جانب امارت جھلک رہی ہے اور دوسری طرف غربت اپنی پست ترین سطح پر ہے۔ یہاں پر ٹیکسٹائل کی صنعت میں کام کرنے والے ملازمین کو روزانہ ۱۲ گھنٹے کام کی اجرت صرف ۱۸۰۰ سے ۲۰۰۰ ہزار ماہوار ملتی ہے۔ کام پر آنے جانے کے لیے مرد وخواتین ورکرز کئی میل تک پیدل سفر کرتے ہیں کیونکہ بس کا کرایہ ادا کرنا ان کی استطاعت سے باہر ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ بنگلہ دیش میں بالعموم قانون پر عمل کرنے کی عادت پائی جاتی ہے۔ ہر بس اسٹاپ پر مرد وخواتین ٹکٹ کے حصول کے لیے لائن بناتے ہیں جہاں ٹرانسپورٹ کمپنی کے نمائندے ٹکٹ کی فروخت کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ بسوں میں مسافر سیٹ کے حساب سے بیٹھتے ہیں اور جگہ نہ ہونے پر اگلی بس کا انتظار کرتے ہیں۔ قانون کی پابندی کی ایک اور مثال گیس اسٹیشن پر دیکھی کہ سی این جی ڈلوانے کے لیے ڈرائیور حضرات گاڑی سے باہر آ جاتے ہیں‘ کوئی مسافر یا ڈرائیور کسی قسم کی بحث نہیں کرتا اور اطمینان کے ساتھ سی این جی بھروائی جاتی ہے۔

مدارس میں کام کی نوعیت

مدرسہ دعوت الاسلام

ڈھاکہ سے ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع مدرسہ دعوت الاسلام کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے براستہ ٹنگی‘ غازی پور ہم دیونا پہنچے۔ مدرسہ کے مہتمم میزان الحق صاحب نے ہمارا نہایت پرتپاک استقبال کیا۔ یہ دو روزہ تقریب اپنے حسن انتظام کے حوالے سے لاجواب تھی۔ یہاں ہم نے نظم وضبط‘ اخلاقِ صالحہ اور اعلیٰ کردار کا بہترین نمونہ پایا۔ مہتمم صاحب نے مہمان خانہ تک ہماری رہنمائی فرمائی‘ جس کے بعد ہم نے جلسہ میں شرکت کی۔

تقاریر بنگالی زبان میں تھیں جنہیں ہم نے مترجم کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی۔ خاص بات یہ محسوس کی گئی کہ تقاریر میں آیاتِ قرآنی کے انتخاب کے ساتھ نہی عن المنکر اور عظمت قرآن کا بیان بھی موجود تھا۔

مدرسہ کے ماحول کا مشاہدہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ہمیں پورے مدرسہ کا دورہ کروایا گیا۔ اس میں ایک جانب رہائشی کمرے ہیں' دوسری جانب مسجد اور تیسری جانب تعلیمی بلاک جس میں درجہ کتب وابتدائی کلاسوں کے لیے الگ الگ حصے مختص کیے گئے ہیں۔ ان کے درمیان وسیع وعریض پارک موجود ہے جس میں کھیل کا میدان بھی ہے۔ جلسہ کا انتظام یہیں کیا گیا تھا۔ رہائشی بلاک کے عقب میں ایک بڑا احاطہ ہے جس میں پارکنگ کے انتظام کے علاوہ ایک تالاب بھی موجود ہے۔ یہ مچھلیوں کی افزائش کے کام بھی آتا ہے اور طلبہ کی تفریح کا مقصد بھی پورا کرتا ہے۔ اسی جانب سبزیوں کے کھیت اور پھلوں کے باغات بھی ہیں۔ ان پھولوں' پودوں اور حسین ماحول نے مدرسہ کو ایک پُرفضا مقام بنا دیا ہے۔ مدرسہ کا رہائشی بلاک مہتمم صاحب کی بصیرت اور اہداف کو واضح کرتا ہے کہ اصل مقصد صرف تعلیم دینا نہیں بلکہ بہترین اخلاق والے صالح نوجوانوں کی تربیت بھی ہے۔ ہر جانب نظم وضبط اور صفائی تھی۔ ایک جانب طلبہ مہمانوں کا اکرام کر رہے تھے تو دوسری جانب ان کی توجہ اپنے معمول کے کاموں پر بھی تھی۔ رہائشی کمروں میں سامان ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ کسی مقام پر بھی کاغذ کا ٹکڑا یا کوئی کوڑا کرکٹ نظر نہیں آیا۔ یہ مدرسہ گزشتہ ۲۰ سال سے قائم ہے۔ اس کا اوّلین بلاک آج بھی اپنی اصل شکل (یعنی مٹی کی دیواریں اور کھپریل کی چھتیں) میں موجود ہے جس میں اس مدرسہ کا آغاز ہوا تھا۔ اسے تاریخی طور پر محفوظ کیا گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر اللہ کی رحمت اور مدد کا یقین ہوتا ہے کہ صرف چھ کمروں کی ایک عمارت سے شروع ہونے والا مدرسہ اب کئی ایکڑ پر محیط ہو گیا ہے۔ یہاں اس وقت کل ۷۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں' جن میں سے تقریباً ۴۰۰ کی رہائش مدرسہ ہی میں ہے۔

یومِ شہداء بنگلہ

بنگلہ دیش میں ۲۱ فروری ''یوم شہداء بنگلہ'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اس دن بنگلہ کو سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ کرنے والے طلبہ اور مظاہرین پر تشدد کیا گیا تھا۔ اس روز سرکاری چھٹی ہوتی ہے اور تمام تعلیمی اداروں میں لازمی تعطیل ہوتی ہے۔ ایک روز قبل رات ۱۲ بجے سے شروع ہونے والی تقریبات اگلا پورا دن جاری رہتی ہیں۔ عوام ننگے پاؤں

یادگار پر پہنچ کر عقیدت کے طور پر پھولوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ مدارس اس دن خصوصی طور پر اپنے ”سالانہ اجتماع“ یا ”یومِ والدین“ کی تقریبات رکھتے ہیں تاکہ طلبہ کو مدارس کے ماحول میں رکھ کر اس تقریب میں شرکت سے محفوظ کر سکیں جسے وہ شرک پر محمول کرتے ہیں۔

یومِ والدین مدرسہ سبحانیہ

اس تقریب میں طلبہ و والدین نے بھرپور شرکت کی۔ طلبہ نے مختلف زبانوں میں تقاریر کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جن موضوعات پر تقاریر ہوئیں ان میں تعلیم کی اہمیت (بنگلہ)، امر بالمعروف ونہی عن المنکر (عربی)، قرآن مجید کے حقوق (اردو)، والدین کے فرائض (انگریزی)، اقامت صلوٰۃ (فارسی)، غیبت (انگریزی) شامل ہیں۔ اس تقریب سے واضح ہوا کہ طلبہ کو دیگر زبانوں پر دسترس دلانے کے لیے اساتذہ نے کتنی محنت کی ہے۔ آخر میں مفتی نعمت اللہ صاحب نے اپنے خطاب کے دوران گھروں میں پردے کے احکام اور حدود اللہ کے نفاذ پر زور دیا تاکہ طلبہ جب مدرسہ کے ماحول سے اپنے گھر جائیں تو انہیں غیر اسلامی ماحول نہ ملے۔

اس مدرسہ کے ناظم اعلیٰ مفتی نعمت اللہ دار العلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہیں اور اس سے قبل جامعہ اشرف العلوم کراچی کے مہتمم رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اس مدرسہ کا آغاز ۲۰۰۲ء میں صرف سات بچوں کے ساتھ کیا تھا۔ اب یہاں ۳۰۰ بچے زیر تعلیم ہیں جن میں سے ۱۷۵ رہائشی ہیں۔ بچوں کو داخلہ چار سال کی عمر میں دیا جاتا ہے لیکن اس سے قبل والدین سے خصوصی ملاقات کی جاتی ہے تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ ان کے گھر کا ماحول کس قدر دینی ہے اور آیا والدین بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے خود کو تبدیل کرنے کے لیے تیار ہیں!!

طلبہ کی تعلیم کا آغاز ناظرہ قرآن سے کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے دو درجے بنائے گئے ہیں۔ درجہ اول میں نورانی قاعدہ سے سورۃ الضحیٰ تک جبکہ درجہ دوم میں چھٹے پارہ تک مکمل کیا جاتا ہے۔ اس دوران طلبہ کو قواعد تجوید یاد کرائے جاتے ہیں اور اسباق کی مشق کے دوران ان کو دہرایا جاتا ہے۔ درجہ دوم میں تیسواں پارہ بھی حفظ کرایا جاتا ہے۔ ان دونوں درجوں کی تعلیم کے ساتھ طلبہ کو کلاس اوّل و دوم کی ریاضی، انگریزی اور بنگلہ زبان سکھانے کا بھی انتظام ہے جس کے لیے روزانہ پچاس منٹ کا وقت مخصوص ہے۔ بہت چھوٹے بچوں کو اس پیریڈ کے دوران دعائیں سکھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد طلبہ کو درجہ حفظ میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے پہلے استاذ، پھر نگران اور آخر میں مہتمم صاحب خود امتحان لے کر طالب علم کو درجہ حفظ میں ترقی دیتے ہیں۔

حفظ کا نظام تین سالہ پروگرام پر محیط ہے۔ اس دوران طالب علم حفظ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تیسری‘ چوتھی اور پانچویں کلاس کی ریاضی‘ انگریزی اور بنگلہ کی کتابیں بھی پڑھتا ہے۔ معلم روزانہ کی بنیاد پر سبق‘ سبقی اور منزل کا ریکارڈ رکھتے ہیں جس میں سنائی جانے والی مقدار اور غلطیاں لکھ لیتے ہیں۔ ہر ماہ طالب علم کی انفرادی رپورٹ اس کی فائل میں لگائی جاتی ہے جس سے والدین کو بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔

حفظ کی تکمیل کے بعد چھٹی سے دسویں جماعت تک باقاعدہ اسکول کا انتظام ہے۔ اساتذہ کرام ایم اے اور بی اے تک تعلیم یافتہ ہیں۔ کل نو اساتذہ ہیں جو طلبہ کو میٹرک تک تعلیم دیتے ہیں۔ میٹرک کا امتحان بورڈ سے دلایا جاتا ہے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران طلبہ روزانہ کی بنیاد پر تین پارے منزل سناتے ہیں۔ جمعرات کو طلبہ نفل نماز میں پانچ پارے سناتے ہیں۔

مدرسہ کے ہر استاد سے اس بات کی تحریری ضمانت لی جاتی ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی یا مار پیٹ نہیں کرے گا۔ اعلیٰ نتائج کے لیے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ اور بچوں میں مسابقت کی فضا پیدا کی گئی ہے۔ اساتذہ کی اچھی تنخواہیں بھی اس ضمن میں ممد ومعاون ہیں۔

عمومی انتظام: طلبہ کی ہر خواب گاہ میں دو اساتذہ کرام کے سونے کا بھی انتظام ہے۔ ذاتی سامان رکھنے کے لیے ہر بچے کو علیحدہ لاکر نما الماری دی گئی ہے۔ ہر فلور پر پینے کے لیے منرل واٹر کا کولر اور مناسب تعداد میں بیت الخلاء اور غسل خانے موجود ہیں جہاں ایک خادم صفائی کے لیے ہمہ وقت موجود ہوتا ہے۔ درجہ حفظ کے طلبہ عشاء تک مدرسہ میں ہوتے ہیں جبکہ درجہ اوّل کے طلبہ کی چھٹی عصر کی نماز کے بعد ہو جاتی ہے۔ ۲۵ بچوں کے ہر گروپ کے ساتھ ایک استاد کی کھانا کھانے کی ذمہ داری ہے۔ مطبخ میں صفائی کا اعلیٰ انتظام دیکھنے کو ملا۔ کھانا تقسیم کرنے سے قبل نگرانِ اعلیٰ یا مہتمم خود اسے چیک کرتے ہیں۔ ضرورت سے زائد آنے والی امداد دیگر مدارس میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔

مدارس کی امداد کا پروگرام

مدرسہ سبحانیہ کے زیر انتظام سامان خورد ونوش مضافاتی علاقوں کے مدارس میں تقسیم کیا جاتا ہے جس کے لیے ایک مربوط نظام موجود ہے۔ مختلف معطی حضرات کی جانب سے جو امداد وصول کی جاتی ہے اس کا علیحدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ روزانہ کے حساب سے بکروں کا تازہ گوشت اور دیگر خشک سامان جمع کر کے ان کے پیکٹ تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام سامان عموماً مہینہ میں دو مرتبہ

تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس انتظام کے مشاہدہ کے لیے ہم ڈھاکہ سے براستہ منشی گنج‘ میانمتی‘ کومیلا ہوتے ہوئے نواکھالی پہنچے۔ یہاں بیگم گنج کے علاقے میں واقع گاؤں میروارث کے مدرسہ **الجامعه العربية الاهلية** میں دیگر مدارس کے نمائندے بھی موجود تھے۔ تمام سامان دیگر مدارس کے ذمہ داران کے حوالے کر دیا گیا اور اس کی رسید حاصل کر لی گئی۔ ان رسیدوں کی کاپیاں معطی حضرات کی فائل میں ریکارڈ کی جاتی ہیں تاکہ وہ جب چاہیں حسابات چیک کر سکیں۔

مدرسة الجامعة العربية الاهلية

اس مدرسہ میں کل ۹۰۰ بچے زیر تعلیم ہیں جن میں ۶۰۰ بچے رہائشی ہیں۔ باقی ۳۰۰ بچے قریبی علاقوں میں موجود مساجد کے زیر انتظام حجروں میں رہائش پذیر ہیں۔ ان میں سے ہر بچہ روزانہ فجر کے بعد ایک گھر میں دینی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے بدل میں ان گھروں سے کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ جاگیر کا نظام کہلاتا ہے۔ اس سے ایک جانب طلبہ کی رہائش کا بندوبست ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ان بچوں کی دینی تربیت ہو جاتی ہے جو مدارس میں داخل نہیں ہوتے۔ ہر گاؤں میں مذہبی فضا بنتی ہے کیونکہ ہر گھر کے ساتھ ایک ایسا طالب علم جڑا ہوتا ہے جو حافظ قرآن اور عالم کا کورس کر رہا ہو۔ اس مدرسہ کے طلبہ میں جذبہ جہاد بہت بلند تھا اور ان میں سے اکثر پاکستان آنا چاہتے ہیں۔ دریافت کرنے پر ان کا جواب تھا کہ ہم جہاد کے شوق میں پاکستان آئیں گے کیونکہ اسی جگہ سے جہاد کا آغاز ہوا ہے اور وہیں سے فوجیں نکلیں گی۔

مدرسہ اکبر العلوم‘ دولت خان

اس مدرسہ میں ۳۰۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جبکہ یہاں رہائشی طلبہ کی تعداد ۲۰۰ ہے۔ یہاں پر ہمارے پہنچنے سے قبل خشک سامان پہنچ گیا تھا جو کہ قریبی علاقوں کے مدارس کے اساتذہ کرام میں تقسیم کیا گیا۔ یہ راشن ایک گھر کے پندرہ روز کے لیے کافی تھا۔ ان اساتذہ میں ایسے افراد شامل تھے جن کی تنخواہ ۸۰۰ سے لے کر ۱۰۰۰ تک ہے اور انہیں کئی ماہ تک تنخواہ بھی نہیں ملتی۔ اس سب کے باوجود یہ دین کی تعلیم پھیلانے میں مصروف ہیں۔ یہاں سے ہم لال موہن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں سرسوتی مدرسہ میں کچھ دیر قیام کیا اور ضلع بھولا میں نبی نگر کے مدرسہ قاسم العلوم میں رات گئے پہنچے۔

مدرسہ قاسم العلوم‘ نبی نگر

یہ مدرسہ ۱۹۹۷ء میں قائم کیا گیا اور اس کا نام حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے نام پر رکھا

گیا ہے۔ یہاں ۱۴۸ طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ مہتمم مولانا شمس الدین نے بتایا کہ اس مدرسہ میں هداية النحو تک تعلیم دی جاتی ہے جس کے بعد طلبہ دورۂ حدیث کے لیے دیگر مدارس میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں مکمل تعلیم نہ ہونے کی وجہ وسائل کی کمی ہے۔ مدرسہ تعلیم القرآن برہان الدین کے دورۂ حدیث کے استاد مولانا عبدالودود نے ملاقات کے دوران بتایا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ایک پاک سرزمین ہے اور انقلاب وہیں سے آئے گا۔

عالمی کرم فرمائیاں

بنگلہ دیش ایک ایسا خطہ ہے جو عالمی استعمار کی خصوصی عنایت کا شکار ہے۔ یہاں پر عالمی ٹھیکیدار کو لسانی سطح پر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تو اس نے درج ذیل طریقوں سے اپنا کام کرنے کا آغاز کیا:

(**۱**) یہاں کے مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کو عرب ممالک میں امام و مؤذن کی ملازمت دلانے کے بہانے لے جایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر سال ۳۰۰ افراد کے انتخاب کے لیے انٹرویو کیے جاتے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ جو افراد مدارس میں بہتر انداز میں آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں ان کو اس سازش کے تحت عرب ممالک میں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ مدارس کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو۔

(**۲**) موجودہ حکومت کے دور میں غیر محسوس طور پر فرقہ وارانہ تفاوت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس سے قبل بنگلہ دیش میں مدارس اور مساجد ایک ہی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور ۹۸ فیصد عوام بھی اسی مسلک کے پیروکار تھے مگر اس حکومت کے آنے کے بعد دوسرے فرقہ کی بھی مساجد بنانے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ہمارے دورہ کے دوران ہی ڈھاکہ کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب کو نمازیوں کی مرضی کے خلاف تبدیل کر دیا گیا۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ سب رینڈ (RAND) کارپوریشن کی سفارشات کی روشنی میں کیا جا رہا ہے اور اس خطے میں امریکی مفادات کی حفاظت ہو رہی ہے۔

تاریخی مقامات

ڈھاکہ میں نہایت اہم تاریخی مقامات ہیں۔ یہ شہر اپنے اندر برصغیر کے سیاسی سفر کی قیمتی شہادتیں رکھتا ہے جو لوگوں کو زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی ہیں۔

لال باغ قلعہ: پرانا ڈھاکہ کے علاقہ میں موجودہ یہ قلعہ مغلیہ دور کی عظمت و سطوت کا شاہکار ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۱۶۷۸ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے شہزادہ اعظم نے کیا لیکن ۱۶۸۴ء میں نگرانِ تعمیر صوبے دار شائستہ خان کی بیٹی کے انتقال کے بعد اس کی تعمیر کا کام رُک گیا۔ البتہ مغل دور میں اس قلعہ کے آس پاس کا علاقہ ضرور تعمیر ہوا جہاں اسی دور کی ایک مسجد بھی ہے۔ اسی قلعہ میں صوبے دار شائستہ خان اور اس کے خاندان کی قبریں موجود ہیں۔ قابل ذکر شے اس دور کا تعمیر کردہ نکاسی آب کا نظام ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ مسلم حکمرانوں کے دور میں بھی ترقی کا عمل جاری رہا۔

احسن منزل: بوڑھی گنگا کے کنارے واقع احسن منزل انیسویں صدی میں تعمیر کی گئی ایک خوبصورت اور پُرشکوہ عمارت ہے، جو اپنے اندر ایک نہایت اہم واقعہ کی یاد محفوظ کیے ہوئے ہے۔ یہ عمارت نواب سلیم اللہ خان کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی اور یہیں ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی سیاسی میدان میں جدوجہد کے لیے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ جس علاقہ کے باسی مسلم لیگ بنانے میں پیش پیش تھے وہیں صرف ۶۵ سال بعد مسلم قومیت کی جگہ لسانی عصبیت کی بنیاد پر معاملات کا ظہور ہوگا!

مزارِ شہداء: ڈھاکہ یونیورسٹی سے متصل ریس کورس پارک میں تین عظیم افراد محوِ استراحت ہیں۔ یہاں مسلم لیگ کا منشور لکھنے والے اور ۱۹۴۰ء میں لاہور کے منٹو پارک میں قراردادِ پاکستان پیش کرنے والے اے کے فضل حق، پاکستان کے پانچویں وزیراعظم حسین شہید سہروردی اور پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے مزارات ہیں۔ یہ تینوں رہنما تحریک پاکستان میں قائداعظم کے اہم ساتھیوں میں سے تھے۔ انہوں نے مشکل حالات میں قائد کا ساتھ دیا اور صرف سات سال کے عرصہ میں ایسی تحریک چلائی جس نے علامہ اقبال کے خواب اور قائداعظم کی بصیرت کو عملی جامہ پہنایا۔ مگر آخر کون سے ایسے حالات تھے کہ یہ اہم افراد جو مسلم لیگ بنانے والے تھے، بعد میں عوامی لیگ اور جگتو فرنٹ میں شامل ہو گئے؟ ان مزارات کے سامنے کھڑا میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو محبّ وطن لوگوں کو ملک کے اندر تحریک چلانے پر مجبور کر دیتے ہیں! ہم نے ہمیشہ حکومت کے خلاف علَم بلند کرنے والوں کو ملک کا غدار ثابت کرنے کی کوشش کی۔ آج بھی پاکستان اسی قسم کے حالات سے گزر رہا ہے اور ہم گروہی، قومی اور لسانی عصبیت کی بنیاد پر تقسیم در تقسیم کا شکار ہیں۔

احسن منزل کے علاقہ میں ہمارے گائیڈ نے وہ مقام دکھایا جہاں مشرقی پاکستان کے ہردلعزیز گورنر جنرل اعظم خان کا گھر تھا۔ اب اس مقام پر فلیٹ سائیڈ بن گئی ہے۔ یہ وہ گورنر تھا جس نے مشرقی پاکستان میں بے شمار ترقیاتی منصوبے شروع کیے۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ روڈ پر ایوب خان کے دور میں گورنر مشرقی پاکستان عبدالمنعم خان کا گھر اسی حالت میں موجود ہے جہاں سے انہوں نے ساڑھے چھ سال تک اس صوبہ کے معاملات کو چلانے کی کوشش کی۔ ان کا عہد معاملات کے بگاڑ کا سبب بنا تھا جس کے بعد آنے والے تمام گورنر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی وردی میں ہی کام کر سکے۔

ان آنکھوں نے ڈھاکہ میں پلٹن میدان بھی دیکھا جہاں ۵ جولائی ۱۹۶۲ء کو شیخ مجیب نے مارشل لاء حکومت کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا اور بالآخر اس شعلہ بیان مقرر نے علیحدگی کی تحریک کے روحِ رواں کی حیثیت اختیار کر لی۔ اسی مقام پر اس نے اپنے مشہور چھ نکات پیش کیے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد بن گئے۔

یہیں وہ مشہورِ عالم ریس کورس گراؤنڈ بھی ہے جہاں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مسلم دنیا کی سب سے بڑی فوج کے ایسٹرن کمانڈر نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ چوبیس ہزار فوجیوں اور ستر ہزار شہریوں کو ایک کافر حکومت کے حوالے کرنے کے لیے اسی ریس کورس گراؤنڈ میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی دستاویز پر دستخط کیے گئے۔ جس اُمت نے تین سو تیرہ بمقابلہ ایک ہزار (غزوۂ بدر) اور تین ہزار بمقابلہ ایک لاکھ (جنگ موتہ) کی حالت میں کبھی پسپائی اختیار نہیں کی تھی اسی اُمت میں چوبیس ہزار جوانوں کے ہوتے ہوئے ان کے کمانڈر نے شکست تسلیم کر لی!

اسی شہر میں میں نے ’’۳۲ دھان منڈی‘‘ کے نام سے وہ معروف مکان بھی دیکھا جہاں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ کی آزادی کا اعلان کیا اور بنگلہ بندھو کا خطاب حاصل کرنے کے بعد پہلے بحیثیت صدر پھر وزیر اعظم قیام کیا۔ ۱۹۷۵ء میں آخر یہی مقام اس کے اور اس کے پورے خاندان کے لیے قتل گاہ بن گیا۔ یہ بھی اللہ کی قدرت کا نظام اور مکافاتِ عمل ہے کہ پاکستان توڑنے والے سب سے اہم کردار کو اس کے دیگر ۱۶ رشتہ داروں کے ساتھ جس روز قتل کیا گیا وہ ۱۴ اور ۱۵/اگست کی درمیانی رات تھی۔ جس مکان میں پاکستان سے علیحدگی کا اعلان فخریہ انداز میں کیا گیا تھا وہیں صرف چار سال بعد اس کو پورے خاندان سمیت نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ اب اس مکان کو میوزیم کا درجہ دے دیا گیا ہے اور وہ مقامات

محفوظ کر دیے گئے ہیں جہاں پر گولیوں اور خون کے نشانات ہیں۔ اس مقام پر اب وحشت کا سماں ہے۔ سامنے بہنے والی نہر اور ارد گرد کا علاقہ اگرچہ سرسبز و شاداب ہے مگر اس مکان کی قسمت میں یہی حرماں نصیبی لکھی ہے۔

جنیوا کیمپ: میرے اس سفر کے سب سے تکلیف دہ مرحلہ میں مجھے سب سے اہم مقام یعنی محمد پور کے جنیوا کیمپ میں جانے کا موقع بھی ملا۔ یہاں کے باسیوں نے ۱۹۷۱ء کے سانحے کے بعد خود کو بنگالی کہلوانا پسند نہیں کیا بلکہ اپنا گھر بار اور کاروبار چھوڑے اور نہایت ظلم و ستم کا سامنا کرنے کے باوجود آج بھی خود کو پاکستانی کہتے ہیں۔ ان کی ایک نسل اس دنیا سے جا چکی ہے اور اب دوسری نسل اپنا تشخص بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ان کے لیے وہ سرزمین تنگ ہو چکی ہے جہاں ان کی پیدائش ہوئی جبکہ وہ ملک بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جہاں ایک اچھے مستقبل کے خواب انہوں نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے ہیں۔ پاکستان میں رہنے والوں کے لیے ان کے حالات کا اندازہ لگانا نہایت مشکل ہے۔ میں وہ دکھ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا جو میں نے ان گلیوں میں گھومتے ہوئے محسوس کیا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں اور اگر ایک حصہ کو تکلیف ہو تو دوسرا محسوس کرتا ہے مگر یہاں ع ”جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے“ کے مصداق ہم ان محصورین کی تکالیف سے آگاہ نہیں ہیں۔

ہم نے وہاں ایک خاندان دیکھا جسے ۱۹۷۳ء میں آٹھ مربع فٹ کا ایک کمرہ الاٹ کیا گیا تھا۔ اب اس خاندان کی تین نسلیں اسی کمرہ میں رہائش پذیر ہیں۔ یہی ان کا بیڈ روم، ڈرائنگ روم، کچن، صحن الغرض سب کچھ ہے۔ اسی گھر میں ماں باپ، بیٹا بہو اور بیٹیاں رہتے ہیں۔ ان گھروں میں رہنے والی خواتین اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے کڑھائی و سلائی کا کام بھی کرتی ہیں۔ ان افراد نے ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے“ کے مصداق لکڑی کے تختوں کے ذریعے ریل گاڑی کی برتھ کے انداز میں سونے اور سامان رکھنے کی جگہ بنائی ہوئی ہے۔ کیا پاکستان کے اربابِ اقتدار، اشرافیہ، سول سوسائٹی اور انسانی حقوق کی تنظیم کو احساس ہے کہ اپنے ملک کی خاطر تکلیف اٹھانے والے ہمارے بھائیوں پر کیا گزر رہی ہے اور کن حالات میں وہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں؟ ان لوگوں سے ملاقات کر کے اور ان کے حالات جان کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ وہ پاکستانی بھائیوں کی ایک نظر التفات کے منتظر ہیں۔ آج ڈھاکہ میں بہاری ہونے کا مطلب موچی، قصائی، حجام، بھنگی اور سائیکل رکشہ چلانے والا ہے۔ یہ صرف

پاکستانی کہلوانے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس دوران جن لوگوں نے خود کو بنگالی کہلوانا قبول کر لیا ان کا معیارِ زندگی بھی تبدیل ہو گیا کہ ان کے بچے اسکولوں میں پڑھ سکتے ہیں اور ان کو نوکریاں بھی مل سکتی ہیں مگر لسانی بنیاد کو شناخت نہ بنانے کی پاداش میں پاکستانیوں پر مظالم ہو رہے ہیں۔

کوشش ناتمام

آخری روز ڈھاکہ میں کام کرنے والی بہاریوں کی ایک غیر سرکاری تنظیم AWARD کے ایک نمائندہ سے ملاقات ہوئی۔ بہاری پاکستانیوں کے لیے کام کرنے والی اس این جی او کا اصل کام ان کیمپوں میں تعلیم کے فروغ کی کوشش کرنا ہے۔ یہ لوگ فی الحال سالانہ بنیاد پر ۳۰ ہونہار طالب علموں کو میٹرک کے امتحان کی تیاری میں مدد دیتے ہیں۔ اس میں ٹیوشن کا بندوبست، فیسوں کا انتظام اور کورس کی فراہمی شامل ہے۔ انہیں گزشتہ پانچ سال میں کافی کامیابی ہوئی ہے اور ہر سال ان بچوں کا رزلٹ ۹۵ سے ۱۰۰ فیصد تک رہا ہے۔ یہ طالب علم اچھے نمبروں سے امتحان پاس کر کے آگے بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تنظیم اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ ان کیمپوں میں موجود سرکاری اسکولوں میں شروع سے انگریزی کے ساتھ عربی، قرآن مجید اور مینجمنٹ کی تعلیم بھی دی جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ قابل اساتذہ کا تقرر خود کرنا چاہتے ہیں تاکہ بہتر مراعات کے ساتھ ان کی نگرانی بھی کر سکیں مگر فی الحال حکومت کی جانب سے اساتذہ کے تقرر کی اجازت نہیں مل رہی۔ اس کے علاوہ ان کے مندرجہ ذیل منصوبے ہیں:

(**۱**) خواتین کے لیے معلّمہ کورس کا انعقاد کیا گیا ہے۔ ان معلمات کو ماہانہ ۵۰۰۰ مشاہرہ دیا جاتا ہے اور ابتداءً ۲۰۰ خواتین کو تربیت دینے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ یہاں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ ناظرہ قرآن، احادیث، عربی، انگریزی، ریاضی اور اردو سکھانے کا بھی انتظام ہے تاکہ یہ خواتین اپنے خاندانوں میں تعلیم کے فروغ کا ذریعہ بن سکیں۔

(**۲**) اس ادارہ کے تحت ایسے گھروں کا قیام بھی زیرِ غور ہے جہاں بوڑھے اور تنہا افراد کے ساتھ یتیم بچوں کو جمع کیا جائے۔ اس طرح ایسے کفالت گھر قائم ہوں گے جہاں ایک طرف ضعیف افراد کو بچوں کی قربت مل سکے جو ان کی ضرورت ہے جبکہ دوسری طرف یتیم بچوں کو بزرگوں کی شفقت مل سکے اور دونوں کو کسی قسم کا احساسِ محرومی نہ ہو!

(ترتیب وتہذیب: محمد خلیق)